



مُدیر: سید مصطفیٰ کمال

محلس ۱ دنار:

منظور حسنه • حیات اللہ • مسح الخمس

محلس مشاورت:

ربندر گھیبی • بھارت چند کھنڈ • خواجہ عبد الغفور • زین الدو تھر • مجتبی حسین

لئے در لائی چشمہ آیا دکاں تھر جھات

ابراهیم جلیس نمبر

لہنامہ

جلد: ۱۱ صفحی ۱۹۷۸ شمارہ: ۵

قیمت: دو روپے پچاس پیسے • سالانہ: ۲۰ روپے
بردنی مالک ہے: (۳۵) شنگ

طباعت یمتو: نیشنل فائل پرنگہ پریس، چارکان، حیدر آباد ۴۰۰۵

طباعت ٹائیپ: اسٹیننڈرڈ اکوپنیش، شانٹی نگر حیدر آباد

طباعت آفیش: سیاست آفیش پریس، جواہرلal نہرو روڈ، حیدر آباد ۴۰۰۵

خطا و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ:

اہنامہ شکوفہ ۳۱ محرم ۱۴۰۶ھ مارک حیدر آباد ۴۰۰۵

نوان نمبر: ۵۷۷۱۶

ابراهیم جلیس نمبر

- گنگہ کیٹ اور وینگ کیک کے اپریشنز ہی

کراچی سٹری کی

مختصر جاہی مارکٹ، حیدر آباد، فون نمبر 43502

ڈسٹری بیوٹر ز برائے:

- ۱۔ موہن میکن بہریور نہر
- ۲۔ ہمسدر درج افزای
- ۳۔ ڈپرڈ فود پرائی کش
- ۴۔ گینگ ایڈسٹریز ٹریچر
- ۵۔ سونا فرڈ پرائی کش
- ۶۔ ڈرک جھوٹان فود پرائی کش
- ۷۔ مڈونا کینگ کپنی، دفتر
- ۸۔ ہارکو، سری نگر
- ۹۔ ایڈن یسٹ کپنی میڈیٹ
- ۱۰۔ پالی پت فود پرائی کش

ب تو انہوں کا بادشاہ ہے،
کیت ولنت کی انتہا ہے یہ

کشمیری قوام

نقش اور سلسلہ جعلیں سے بچنے اور
اہل کشمیری قوام خریدنے کے لئے اس کے
ذبیح اور پیکنگ کو بنبرد تیکھے ہے۔
تیکار گلستان

پہنچ داں نجھپور داہش نیٹ

گزار وضیں حیدر آباد (۰۰۰۵۰۰)



اس تھیل کے چڑے بڑے (فہرست)

مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا (انٹخاب)

۵۹	ابراہیم جلیس	جلیس کی کہانی	ابراہیم جلیس
۶۱	"	نیا مرض	"
۶۳	"	نسلی زندگی	"
۶۸	"	فیٹی ما	"
۷۱	"	کچھ پیدل چلنے کے بارے میں	"
۷۷	"	میاں۔ محمد رحیمی شوفر	"
۸۰	"	زنافی شلوار	"
۸۳	"	جوں کا توں	"
۸۶	"	پتے کی بات	"
۸۹	"	دہ دہ کیا میاں کیا بھی	"
۹۲	"	سیاہی بچہ بچی	"

یا رب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا (تعزیت نامے)

۹۵

شیطان کی آنت (قطط دار نادل)

۱۰۱	پردیزید اندھہ دی	پھر میں گے اگر خدا لا لایا
۱۰۴	(اداریہ)	(اداریہ)

سب ایسا کہیں جسے (شخصیت)

۱۰	علی سردار جعفری	ابراہیم جلیس
۱۱	ابن الشاه	ابراہیم جلیس
۱۲	یوسف ناظم	جب کی بات
۱۴	مجتبی حسین	ابراہیم جلیس کی یاد میں
۲۲	عاقق شاہ	ہم خاک نشینز کی
۲۵	آمنہ ابو الحسن	دو مک ایک جذبہ
۲۸	ضیار الحسن موسوی	کیوڑے کا پھول مر جاگیں
۳۲	نصر الدین خاں	ہلے جیس
۳۲	سلطانہ مہر	سبت شکر جلیس

ہم تو عاشق ہیں تمہارے "کام" کے (تنقید)

۳۲	ابراہیم جلیس کے کچھ تقدیس، دھنیخہ اختر	ابراہیم جلیس کی کچھ یادیں
۳۳	ابراہیم جلیس کے دُر پور تماز شمسِ احمد	ابراہیم جلیس کے دُر پور تماز
۵۰	منظر عاشقی	منفرد ادیب افسہ درست
۵۵	منظرا مکان	پردیزید اندھہ دی

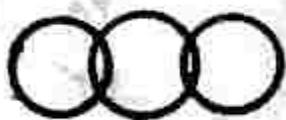
روزنامہ "معیا بعثت" میں مطبوعہ مضامین کا مجموعہ

شہر حیدر آباد

اس مجموعی کتاب میں شہر حیدر آباد کے محلوں، دروازوں، قدیم قطب شاہی اور آصفی عهد کے آثار، تلک پر اہم اہم
دستاویزی مضامین اور دکن کو شعرا کا خراج عقیدت
مضمون لیکارہ :

ڈاکٹر نور، پروفیسر ہاردن فال شریانی، کرسنٹ ناسوا می مدیراج، نواب مفخم جاہ، ڈاکٹر برام کرشنا راؤ
مشعر کے دی رنگاریڈی، تکمین کاظمی، نصیر الدین ہاضمی، رائے محبوب نادران، ہمزمرا کاؤس جی، ہجی الدین احمد
غلام زیدانی، غلام ربانی، پروفیسر منظور عالم، مشڑی کے باوا، منصب جنگ — اور وقار خلیل

صفحات ۱۱۹۰۱ میلہ دیکھائی سائز قیمت بیش روپے



برہمیہ اشعار

(اردو اور ہندی رسم الخط میں)
روزمرہ محاورہ نیز فرب المثل کے دیڑھ سو نمائندہ اشعار کا گلستان

صفحات ۶۳۶ میلہ گردپوش قیمت : پارہ روپے

— (ملنے کے پتے) —

دفتر روزنامہ سیاست براہر لال نہرو روڈ حیدر آباد۔
اردو اکیڈمی بک ڈپو سیف آباد حیدر آباد۔ ۲۳



ابراهیم جلیس — چند تصاویر



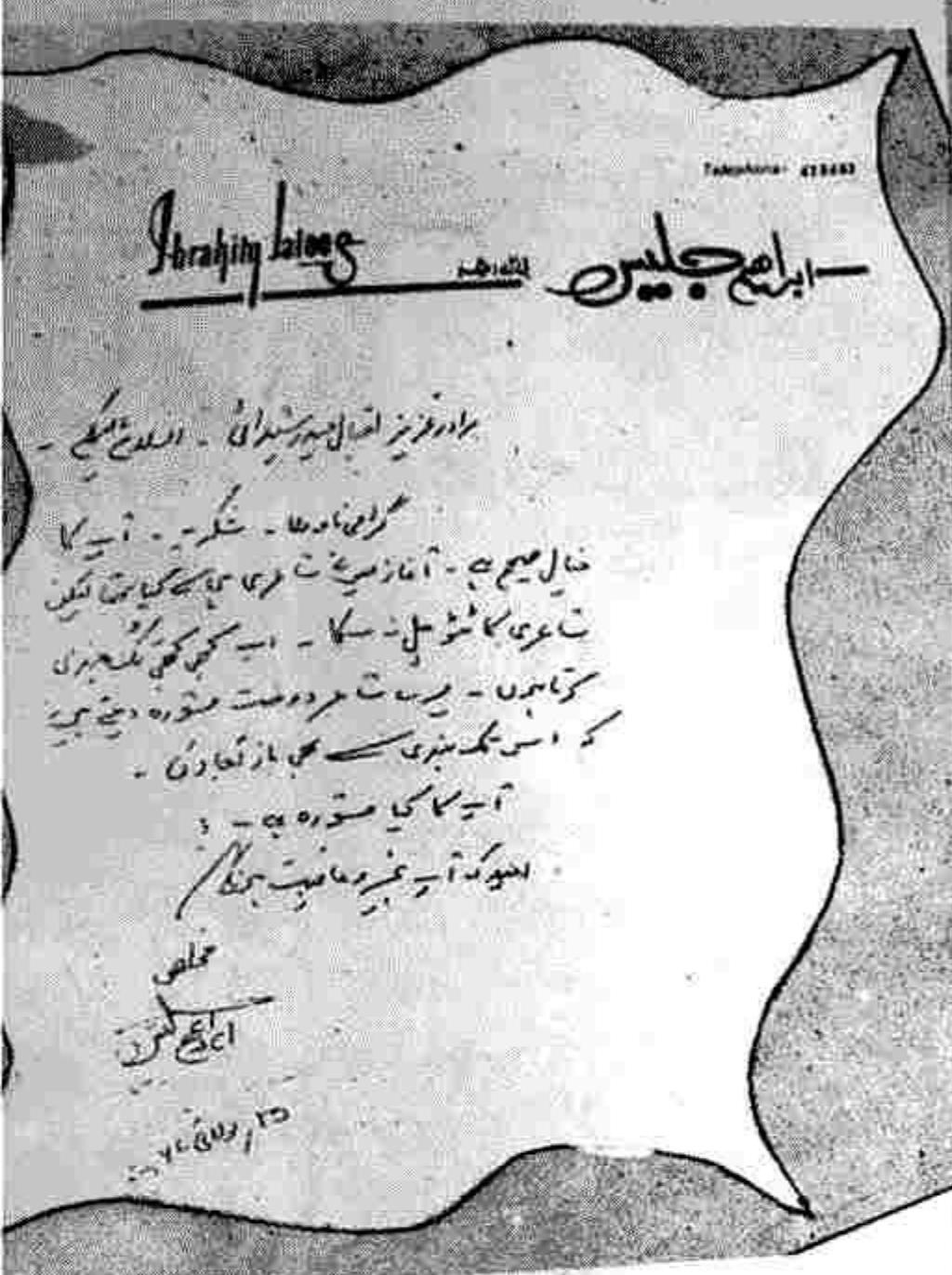
ابراہیم جلیس رفیقة حیات اور بچوں کے ساتھ (۱۹۶۱)



ابراہیم جلیس کا دورہ امریکہ



۱۹۶۷ء میں دورہ امریکہ کے موقع پر مشہور امریکی اداکار راک ہڈن کے ساتھ



سان فرانسکو کے ہواں اڈہ پر (۶۱۹۶۲)



ابراہیم جلیل کے فرزند اکبر شہریار جلیل (جیف روپرٹ روزنار مشرق،) سے بے نیف بھٹو انہمار تعزیت کر رہی ہیں

ابراهیم جلیس ایک دلنواز اور بے تاب روح کا نام تھا۔ اس کے سینے میں آزادی انسان کا تڑپ تھی جو لفکوں کی عورتی میں اس کے قلم سے کاغذ پر کبھی اشکوں کی طرح پیکتی تھی، اور شعبی ترک سبسم کی طرح پھر تھی۔ اس نے بڑی نوی سماں کے زمانے میں انسان کی تذلیل و بخشی تھی میں نے اس کے رن میں انسانی وقار کی آمد دیدا کر دی تھی۔ وہ اس وقت حیدر آباد دکن میں رہتا تھا۔ نو عمری کا زمانہ تھا۔ تلوار اور بندوق اس کے ہاتھوں نہیں تھی۔ وہ صرف قلم تک پہنچ سکتا تھا۔ اور اس نے قلم کو اٹھایا اور آخری سانس تک اس قلم سے جہاد کرتا رہا۔

اس کا میدان رجنگ ہندوستان تھے کہ پاکستان تک پھیلا ہوا تھا۔ اس نے شہر دع میں انسانہ نگاری اور نادل بنا گئی۔ لیکن اس کی جلدیاں طبیعت نے یہ محسوس کیا کہ شاید افسانہ اور نادل کی دفعہ اتنی تیز نہیں ہے جتنی صفاحت کی دفعہ تیز ہوتی ہے یا شاید اس کے مزاج میں صفاحت زیادہ تھی اسلام کے جب اس نے اپنے قتل اٹھایا تھا تو وہ ایک افسانہ نگار تھا۔ اور جب اس نے اپنا قلم ہٹھی کے لئے رکھ دیا تو وہ ایک بے باک صحافی تھا۔ صفاحت میں اس کے جو ہر بہت چکے لیکن اس کی قبل از وقت مرمت نے ان جوہروں کی تابتا کو کو جھلی کی چمک حاصل کرنے نہیں دی۔

ہم اب اس کے لئے سوگوار ہیں۔ وہ جو ہماری محفوظ کو چھوڑ کر چلا گیا لیکن اس کا قلم، اس کی دراثت ہے۔

کوئی نہ کوئی بے باک صحافی اس کو اٹھا لے گا

اور

ابراهیم جلیس کی روایت آگے بڑھ جائیگ۔

ابن القاسم

ابراهیم جلیس

ابراہیم جلیس سے ہماری کوئی نسبتی تھیں، کئی رشتے تھے بہت پرانے اور بہت حکم۔ وہ ہمارا اہتمام تھا۔ ہمارے ہر دنکے سکھ میں شریک اپنے درود تھا اور ہم جلیس تھا۔ وہ یوں کہ مگر اس کا ہمارے محلہ میں پڑتا تھا اور دفتر اس کا ہمارے دفتر کے مقابلہ مکان کھڑکی کھول کر ہم ایک دوسرے کو آواز نہ دے سکیں تو صورت تو صدر دکھانے کے تھے یا یہ ہوتا تھا کہ وہ سب کو شہزادگانہ تو اس کے ہاتھ ملے فتن قریب ہی۔ سناؤ سردار جی کی حالاتے

۱۹۳۶ء سے ہوتا آئے تھے اللہ جنمیں لحد ان کے دونوں ہاتھ رکھ کر اتنا
اٹھ رستنگھمی ”دہ بڑے زناٹے کی پنجابی بو لئتھے اور اب سے نہیں، ۲۷

جسٹر افسر مدد سپہ حاکر نا ڈیتا تھا۔ ہم تینوں بھائیوں کے متعلق کہا کرنا

تھے کہ یہ لوگ سُکھ ہیں لیکن ان میں صرف ایک ایسا فنڈار

ہے جو اپنے نام کے ساتھ، اب تک سردار نہ کھٹا

۶۔ اشانہ ہمارے لامبے والے بھائی

کی طرف تھا جس کا نام سردار۔

محمد ہے نیک

جلیس اسے سردار محمود نگہ کھتھے تھے۔ ہمارے بھیجے بابر کے ساتھ انھوں نے اور نسبت نہ کالی تھی اسے اپنا آرٹیجی و ریف کہتے تھے لے متعارض تھے اور اسے اپنا نام اب ایم (لوڈھی) لکھتے تھے۔

بہت ادن پہلے کی بات ہے، دوسری جنگ عظیم کے آخری دنوں کی بجہم درصیانہ میں ساہر لدھیانی کے چوبارتے میں عقل جایا کرتے تھے، انہی دنوں اب ایم جلیس کا نام ہم نے پڑھا اور سنائے۔ پڑھاتو ادب دنیا کے کسی پرچہ میں۔ مساویوں کے ساتھ ان کی خط و کتابت تھی، بڑے لمبے لمبے خط آتے تھے۔ ان میں مصالب کا بیان ازما تھا کہ تیسرا فاقہ ہے! دنیا آنکھوں میں اندر صیرے چھٹ سے رکھی باندھ رکھی ہے۔ انھی خط پرست کر کے اس کا پھندا لگے میں ڈال لوں گا۔ ادھر سے ساہر لدھیانی بھی بیٹا بھرا فطح لکھتے تھے جس میں بدھالیکے بیان میں اس سے باز کالے جلنے کی کوشش کرتے تھے۔ دنوں خواہ مخواہ بے روزگار گریجو ٹوں کا روپ بعصار اکتے تھے حالانکہ فی الواقع دنوں کھلتے پہتے فارغ الیں گھر انوں سے تعلق رکھتے تھے بلکہ ہم لوگوں سے مقابلہ کیا جائے تو چھوٹے موٹے رئیں۔ دنوں افلاب بھی تھے۔ چنانچہ جنیں کے ہاں بیٹی ہر لئے تو اس نے اس کا نام دس کی سرفراز دشیز کے نام پر زدیا رکھا۔ انہی دنوں ہم نے بھی لکھنا شروع کیا اور جلیس حیدر آباد دکن کے کسی ماہنامے کے ایڈٹر ہو چکے اور اب ان کی ہم سے براہ راست بھی خط و کتابت شروع ہو گئی۔ غائبانہ ربط بین طبیعت اور سقوط حیدر آباد کے بعد لاہور آئے تو ہمارے ہمی غریب فانہ پر قیام کی جو دیڑھو کو ٹھری کا حصہ ہم نے سامنے کے پر آمدے پر پردہ ڈال کر اپنے لئے کرہ بنارکھا تھا جس میں مشکل سے بھنس پھنسا کر دو چار پائیں آتی تھیں۔ کئی ہزار میل دور بیٹھے تسلوہ میں اس گھر کا نقش باندھنے کی کوشش کرتا ہوں جو کہ اُن کا گھر تھا۔ چاہک ایک دوسرے گھر کے چھپوارے میں واقع تھا۔ اس کے اوچے یک ستگ گذرا گاہ۔ اس میں وہ سورہ کھڑی رہتی تھی جن کا سب سے زیادہ مذاق وہ خود اڑاتے تھے، ان دنوں کا احوال انھوں نے اپنی کتاب "دو لک ایک کھانی" میں لکھا ہے۔

ہمارے چھوٹے جھانی محمد ریاض ان کے لئے سنتے سے سنتے سرگیٹ تلاش کر کے لاتے تھے اور اس خدمت کا معادنہ یوں وصول کرتے تھے کہ اپنے نکھنے تھے اور زبردستی ان کو سنتے تھے۔ جلیس کا بیان ہے کہ ایک روز تو میں سیکل پر سمجھ کر فراہ ہو گیا لیکن افسانے کا ربط نہ ٹوٹا کیونکہ موصوف اپک کہ سائکل کے کیری پر سوار ہو گئے تھے۔ جلیس کی گفتگو میں جھوٹ اور سچ کو الگ الگ کرنا آسان نہ تھا کبھی خالص سچ بونا ہوتا ان کو ٹھری کاوش کرنے پڑتی تھی اور کہتے ہیں بعدی ہمیر کی ملامت بھی شفتنی پڑتی ہے یعنی ان کا تکیہ کلام ہوتا ہے "خدا جھوٹ نہ بلداۓ یہ فرمایا کرتے تھے کہ "خدا سچ نہ بلداۓ"۔

سمی جانتے ہیں کہ یہ ان کے مزاج کا ایک بله ہزر خاص تھا۔ ان کی زندگی لطیفہ پیدا کرتے گزری۔ تحریر سے عجیازیاں تقریباً میں عام زندگی میں، مگر میں محفل میں اگر کسی کے لئے بندگا وہار کا خط استعمال کیا جاسکتا ہے تو وہ میاں جلیس تھے۔ کبھی وہ اپنا مضمون پڑھتے تھے تو سال باندھ دیتے تھے ہم نے انھیں ہر موقع پر یہ مشورہ دیا کہ کام لکھنا ایڈٹر کی بھیانہ کرنا یہ بڑا جنجال ہے اسے کبھی انھوں نے مانا، کبھی نہ مانا۔ نہ ماننے کا نیچہ ہمیشہ افسوسناک ہوا ایک اتنا بھی افسوس ناک ہو گا، یہ کسی کو خیال نہ تھا۔

ع گلی، ہم نے کہی تھی تم تو دنیا چھوڑے چاہتے تو

جیلیں ظالم نے ہمارے پر دیں۔ یہ مایس آنے والے بھی انتظار میں کیا ہے تم کون سے ایسے تھے کھرے داد دستردے۔
چند یوں ہوئے، خود نے یک لخت سکوپت پیا پھر ٹباقا نیس پیشیں بہس کی عادت یا کلم ترک کر دی کیونکہ
ڈکھروں نے انکے لگے کی خراش دیکھ کر انہیں خاہر کیا تھا کہ یہ فلک کینسر عجی بن سکتا ہے، اس کی احتیاط تو انھوں نے کول
یکن مرت کے اتنے سارے چور دمادانے ہیں سب پر پھرہ نہ بھایسکے۔ پاد سال لٹکے دل نے ان سے بے وقاری کی،
ہستا، یہ رہے جس کی معادوں کے مضمون یہ ہے۔ رات تھوڑی ہے کہاں لمبی۔ خدا کا فضل ہوا، پونچاں واپس
ئے اور اب بظاہر ٹھیک ٹھاک تھے۔ اسی ہمینے نے شروع میں لذن ایک دوست کو خط لکھا جس میں یہاں نہنے کی خوشیں
ظاہر کی تھی۔ لمحا کہ سارے بچے ہوان اور سیر رونڈ گاہیں۔ صرف دو لڑکوں کی شادیاں باقی ہیں وہ بھی الشارائیں دکھریں
تمیل پائیں گی۔ دسمبر میں دن ہیں کئے رہ گئے تھے۔ دو ہمینے، ظالم مرت کے فرشتے نے اتنی بھی مہلت نہ دی۔ بچیاں باہر زاد
لکھر دیں۔ خدا اپنے گھر کی ہو جائیں گی یکن ان کے اس بچے کی زندگی کا خدا کون پر اکر لیگا جو بچپن میں سر پر چڑھا لئے
تھے سے داغی طور پر مددور ہے۔

بجد سے وہ مورپہ حملہ رہے ہے۔ اب تو ایک حدت سے وہ خود اپنے بیان کے مطابق ادب کے کمپے سے باہر نکھلے کالم نگاری اور صحافت ہی ان کا اور طبعنا بچھونا تھا لیکن ان کی اٹھان، بیجیت ایک طبائع افسانہ نگار اور مزاح نگار کے بڑی شاذار تھی اور ان کے مد اخوں کا حلقة بہت وسیع تھا۔ ان کی طبیعت کی خوبی کے لئے ان کی بعض کتابوں کے نام دیکھنا کافی ہیں۔ ”ستکناریس“ پالیس کرڈ بھکاری ” ”کا لا چور“ دغرو ”ان کے کاموں کی بھی جو وہ ”جنگ“ اور ”انجام“ میں فتحتے تھے بڑی دھرم تھی، ان کا اندازہ فکر ہیشے سے ترقی پسندانہ تھا اس امر کے لئے انہوں نے ”کھوڑ کے بول“ بھی سہی۔ حتیٰ کہ ایکبار اپنے ایک مضمون کی بنائپر قید و بندگی صعوبتوں سے بھی گذرا ہے۔

اپنی بیگم سے بھی ان کو عجیب طرح کی آنکھ تھیں، جو سلیقہ مندی اُجلیس کے رہن سہن اور پُرشش میں تھی وہ گھرادر دفتر میں بھی جعلکرنے تھی۔ اخبار یا کتاب پڑھتے تھے تو، اس میں نشان لگاتے تھے، تراشتے رکھتے تھے اندان کا ایسا باموقع استعمال کرتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ ان کی زندگی بھر پور تھی۔ حیدر آباد کی زندگی، بیسوی کی زندگی، لاہور اسلام کراچی کی زندگی۔ دوسرے پہلو سے دیکھئے تو ان کی ادبی زندگی، صحافتی زندگی، فلمی زندگی اور سیاسی زندگی ان سب پر ان کی اپنی زندگی کا چھاپ شکفت اور تعریف آفرس ہونے کے ساتھ ساتھ سخنہ و اور دید مسدے۔

یہ کن ”رات تھوڑی ہے کہانی بلی“ نہ جلیں اسے اس عنوان کے تحت مکمل کر سکے، نہ یہ ہمارے اس مضمودی میں
سماں کتی ہے۔ ادیب ابراہیم جلیں کا نام تو پائندہ رہے گا لیکن اپنے ابراہیم جلیں کر، اپنے ناول فکن کو سہاں دھونڈیں
کہاں چاکر آواز دیں۔ لے خوش گفتار ترکیے یکایک چُب ہو گیا۔

(”جنگ“ کراچی سے)



جید آباد

یوسف ناظر

۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۰ء تک ۳۰ سال کا مبارعہ میں یوں معلوم ہوتا ہے۔ آنکھ جھپکتے گزر گی۔ ابراہیم جلیس پرسوں ہی تو جیہے آباد سے پاکستان گئے تھے۔ کل دہائی پہنچے ہوں گے اور آج خبر آئی کہ ان کا انتقال بھی ہو گیا۔ کی بر ق رفتار شخص محتاج ہوا کے جھونکے کی طرح گزر گیا۔ اس کا قلم بھی اتنا ہی بر ق رفتار رکھتا تھا۔ ابراہیم جلیس نے جب حیدر آباد کو چھوڑا تو اس کی عمر ۲۰ سال سے زیادہ نہ ہو گی۔ لیکن وہ اس وقت تک ہندوستان کی شہریت کا ادیب بن چکا تھا۔ اس وقت اُردو کی دنیا بہت دیکھ تھی۔ وہ پورے غیر منقسم ہندوستان کی مقبول ترین زبان تھی۔ اس زمانے میں اُردو کا صلب اول کا ادیب بننا ذرا عاصی بات تھی۔ هر فہرست میں کوئی لوگوں کو ریکنیشن (RECOGNITION) ملتا تھا جو صحیح مخنوں میں قلم کے دھنی اور نکھنے پڑھنے کے دھنی ہوتے تھے۔ نشر نگاروں کو یوں بھی دیر سے پہچانا جاتا ہے کیونکہ انھیں سئے جانے کی سبوت عامل نہیں۔ انھیں پڑھ کر بی جانا بسکتا ہے۔ لیکن ابراہیم جلیس نے ۱۹۴۰ء انسدادی روڈ (بہر ڈل ریس) میں اپنا نام کافی اور جاندی کے تھے۔ پانے والوں کی فہرست میں نہیں سونے کا تندھا حاصل کرنے والوں کی مختصر سی فہرست میں لکھوا یا۔ زرد چہرے اور سکونا دیس کا یہ نوجوان مصنف آج سے ۱۹۴۰ء سال پہلے ہماقہ آؤ افزاد نگار بن چکا تھا۔ اس وقت کے حیدر آباد میں دو ہی نوجوان محبوب تھے۔ شاعروں میں نظر حیدر آبادی اور نشر نگاروں میں ابراہیم جلیس۔ نظر حیدر آبادی کی شاعری کی عمر زیادہ تھی۔ اس کی مقبولیت اور محبویت کی رفتار دھیمی لیکن مستحکم تھی۔ بدخلاف، اس کے ابراہیم جلیس کی ترقی کی رفتار میں طوفان کی سی تیزی تھی اور اس کے ہم جلیس سے رشک اور حیرت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔

جامعہ مختلفیہ حیدر آباد کی تحریر شدہ عمارت، آرٹس کالج کی افتتاحی تقریب ۱۹۴۹ء میں صرف دھوم دھام ہی سے نہیں بلکہ ترک دا حصہ کے ساتھ منعقد ہوئی تھی۔ (کوئن و کوئنیہ کے جشن تاجشو شی کی برابر برابر شان کی تقریب تھی)۔ اس وقت پوری ریاست حیدر آباد میں عرف ۲۰ عدد کالج تھے اور وہ بھی عرف انگریزیہ کالج۔ ایک حیدر آباد میں یعنی ڈیکان اور باقی ۲ اور نگر آباد، ملکر گہ اور درنگل میں۔ ان تین مکانوں پر تجویز کیا گی اس نئے قائم ہو گئے تھے کہ یہ تینوں مکانے میں سو بول کے مستقر تھے۔ آرٹس کالج کی افتتاحی جشن میں، اسلام کے کالج کے نمائندوں کو شریک ہونے کی دعوت دی گئی تھی تاکہ وہ دیکھ سکیں کہ ڈگری کالج کیسا ہوا کرتا ہے۔ اسی تقریب میں ابراہیم جلیس سے پہلی اور صدری ملاقات ہوئی تھی۔

وہ بکرگرد کا بھائی طرف سے اور جگ آباد کا بھائی طرف سے شریک ہوا تھا۔ اضلاع سے آئنے والے ملاب علوں کے لگران اور صریح رہا صحجوں میں جگہ تھے اور وہی اس طاقت اپنے حفظ تھے۔ اس وقت ابراہیم علیس کی نیشیت صحجوں میں جگہ کی تھیں ملکی دب میں چار سو سال بعد، ابراہیم جانش سے غیر طاقت روزیں تو سب سوں ملکی دب میں تھیں۔ پس پہنچنے والے جگہ کو ابراہیم جانش، پر جانش کی نیشیت سے یاد کیا جاتا تھا۔ ملکی دب کی آزادی اور محلی نفعا میں سافس لینے کے بعد ابراہیم علیس کو ایک سرچھرے ہے جزوی اور باقی ادیب کا ایج لے چکا تھا۔ حیدر آباد کی ادبی محفوظ اور سمجھتوں میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ یہ کافی سٹ اور اذان بالغین بلکہ واقعہ ہے کہ اس کی نیشیت سرگردی کی ہو گئی تھی۔

عابدِ رہنما کے نکو پر جائیوال کی لگتا بول کی وہ ان مکتبہ ابراہیمیہ، نظامیہ جوپل، پیام کا دفتر، ریڈیو اسٹیشن، عظیم جاہی مارکٹ پر، پان کی مشہور درود دکان اور رضیہ بیگم، مگر (جہاں اولیٰ محفلین منعقد ہوا کرتی تھیں) یہ سب ہم تو گرد کر چلنے کے لذتے تھے۔ اس زمانے میں اہلبی سرگرمیاں اور ہنگامے سے ذرا زیادہ ہی تھے۔ موئے شاعر دل کے ابراہیم جلیس کی موجودگی ہر جگہ ضروری اور بعض جگہوں پر اشده فروری تھی۔ جس محفل میں بھی وہ موجود ہوتا تھا سے زیادہ بحث دہی کرتا۔ اور جس محفل میں وہ نہ ہوتا اس کے افانے "موضوعِ بحث" رہتے۔ کوئی کہتا جلیس نے انسانے میں کوئی خاص تجزیہ نہیں کیا ہے۔ کوئی رائے دیتا جلیس بھی انہی موضعات پر لکھ رہے ہیں جن پر آج کل درسے افانہ نگاری کھاکر تے پیں۔ کسی اداہ شخص کی آواز اُبھرتی، جلیس نے عام آدمی کی زندگی کو قریب ہے دیکھا ہے اور وہ اس زندگی کو افانے کا روپ دینے کافی جانتے ہیں۔ گوئی کہتا، ہاں افانہ نگاری کے ساتھ ساتھ جلیس نے خاکہ نگاری بھی کی ہے اور بعض غاکے تو بڑے زدد دار لکھے ہیں۔ ایک رائے ہوئی، یکن وہ سوچتے کہ شن چندر کی طرح ہیں۔ لیکن سب کے سب اس کے اذان پر سیان کی مددانی اور حسن کے قافی تھے۔ زدد چہرے نکہ کر دہ بے حد ضرور تھا۔ اس کہانی کی خاص طور پر ہر جگہ دھرم تھی۔ آصف، ایک جز ماش کلر اپنی جوان بیہن کی شادی کی فکر میں سرگردان رہتا ہے جو جوان تھی اور پانچ حل سے اپنے دل کا انتشار کر رہی تھی۔ نہ چانے اس کا دل کون تھا؟ کیا تھا؟ کہاں کا رہنے والا تھا اور کب تھے والا تھا؟ — آصف کو کچھ ایں محسوس ہوا کہ جب تک اس کی بیہن کے رخانوں پر گیندے کے پیسے چھوٹے ہیں

اس کا دلھا بھی نہ آئے گا کیونکہ درٹھے گیندے کے پھولوں کو مہان پستہ نہیں کرتے، وہ تو گھاپ کے سرخ سرخ پھولوں پر جہاں دیتے ہیں۔ . . . پوری لہانی زہر میں بچھے بونے تیرہوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ وہ مسکرا دیتا۔ اب اس کے ہونڈ مکنے لگے تھے۔ بار بار مسکر رہتے تھے۔ ایک ہیئت میں اس کو پچاسی روپے ملتے تھے اور وہ پچاسی دفعہ مسکرا آتا تھا۔ وہ اپنی بہن ک شادی کرنے میں کامیاب ہوتا ہے لیکن خود اپنے عشق میں ناکام۔

آصف نے برجیس جہاں کے باپ کو اس کے بے تکلف دکستوں اور عزیزوں سے کہلا بھیجا کہ وہ برجیس سے محبت کرتا ہے۔ برجیس کے باپ نے جاپ دیا کہ شادی کے نہ محبت اتنی ابھی نہیں۔ بیوی کو اچھا مکان، اچھی نہاد، اچھے کپڑے، زیادہ ضرورتیاں میں۔ آصف کے دو قیب نیلام کی بولی لگا رہے تھے۔ میرے تین مکانات میں، وہ تینوں برجیس کے نام نکھل رہا گا۔

• میری آمدی چار سو روپے مابوارہ ہے :

• میری جاہریت کی دہان ہے، برجیس، سانہ عمر جنکھاتی ہے گی :

آصف پھر ایک انگریز لاکی کے عشق میں بتلا ہو جاتا ہے۔ اسی انگریز لاکی کے ہاں ایک دن، اس کی ملاقات اپنے بہنوں سے بہتی ہے۔ اور اسے پتہ چلا تھے کہ دہار، اس کے بہنوں کی آمد رفت سے عقلى طور پر ہے۔ رفتارت سے زیادہ بہن کی محبت اس کو پائیں بنا دیتی ہے۔ اور وہ مس ناکس کو برسِ عام قتل کر دیتا ہے اور جتنے چیزے کر کہتا ہے بیکھرو سارا چورا بواخون بہہ رہا ہے۔ اب میری بہن کے رخ رہوں پر گیندے کے پھولوں نہیں مکھیں لگے۔ ہاں ہاں اب وطن ... یہ آزادی اور تحریک و غزرے پہلے کی لہانی ہے۔ ابراہیم جلیس نے ایسی کمی کہانیاں مکھیں۔ نہلے درجے ... منور سلطنتی کے افراد کی شخصی زندگی کی تصویر کھینچنے میں ابراہیم جلیس کو کمال حاصل تھا۔ اس کی سمجھی کہانیاں میں صاحبی اور سیاسی شعور ملی آگ روشن ہے۔ ابراہیم جلیس خود ایک دلختے ہوئے لامے کی طرح تھا۔ ۱۹۲۸ء یا ۱۹۲۹ء کے بعد ابراہیم جلیس سے پھر کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ اس نے میرے ذہن میں صرف اس کی نوجوان، کھنڈرے اور نذر ابراہیم جلیس کی صورت محفوظ ہے جو نشگہ پاؤں بجلتے کرلوں پر چلنے کا عادی تھا۔ اور آٹھ بھی میں یہی محبوس کرتا ہوں کہ جس شخص کا انتقال ہوا ہے دہ ۱۹۲۵ سال کا دہی ابراہیم جلیس بوجا جو آندھی کی طرح آگ کے بڑھاتے تو س قرع کی طرح اُبھر اور شعنے کی طرح ہرایا تھا۔ یوں بھی ادیب کی عمر کا پیاہن ماہ و سال نہیں، اس کا قلم ہوتا ہے۔ اگر اس کے قلم کی نوک خبر کی آنکی کی طرح تیز اور تھانی رہی ہے تو ادیب صرف نوجوان بھی نہیں رہتا، مرتا بھی نہیں ہے۔

اہم چند نوں سے ابتداء دنیا میں ایک خطرناک رجمان یہ پیدا ہو چکا ہے کہ جب بھی کوئی ادیب، شاعر، صحافی یا اُردو کا خدمت گزار مرتا ہے تو یہ مطابر کیا جاتا ہے کہ اس کی کوئی یادگار ضرور تالم ہوئی چاہئے۔ نکاٹیں ہوتی ہیں بلکہ طعنے تک دیئے جاتے ہیں کہ اُردو والوں نے مرنے والے کے لئے کیا کیا؟، اگر پیسے بھی ایسی ہو گا کہ تو محمد حسین آزاد، مولانا الطائف حسین حال، فضیل نذیر احمد احمد ان پر پہنچ جائے والوں سوادا، مصطفیٰ ناتھ سمجھی کی یادگاریں آج بھی موجود ہوئیں اہمان کے دشمن یا دگاروں کے نہیں جوستے۔ چند کام لیے جسے تھوڑی جوش کا صد ہوتے ہیں وہ دہ جاری لغت میں لا تھیت کا لفظ نہ ہوتا۔ کچھ کام نہیں قیمت ہنسیں لہا قیمت ہو گا کرتے ہیں۔ اور ایک تین میں اُنکے ایک ہے۔ اگر کسی ادیب، یا شاعر کو محبت یا پیار سے یاد کر لیا گیا یا اسے پڑھوایا گی تو یہ بہت ہے اور اب کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے جو زندگانی اُنکے دہ اس سے بھی ازیادہ لفاظی کا ذہان ہو گا۔ ہوا ہوں فطرزادیت میں تو سن اے تیر لا تیز رہی دخیل نشاط مجھ کو نہیں ۵۵

مجتبی حسین

ابر، سرکم پیلس کی بادیں

ابراہیم جلیس انسان زنگار تھے گریہ۔ یہ صرف افسانہ تھے۔ حالاں کہ وہ میرے بڑے بھائی تھے۔ وہ پڑ دسی بلک کے شہر کوچی میں رہتے تھے۔ مگر لگتا تھا کہ وہ لاکھوں کر در دل میں دُو بیں۔ حالاں کہیہ فاعصلہ چند سو میل سے زیادہ کا خیز تھا۔

وہ مجھ سے بارہ تیرہ برس بڑے تھے۔ لیکن لگتا تھا کہ کافی عمر سیدہ ہو گئے ہیں، حالانکہ ان کو محرم ۱۵ برس سے زیادہ نہیں تھی۔

حقیقت جب افسانہ بن جاتی ہے، فام سے جب بچپن جاتے ہیں، عمر میں جب دھونکہ دھونکہ دینے لگتی ہیں تو دو جاں توں سے رشتہ کرنے لے جس، جب راوسے معنی ہو جاتے ہیں۔

جاتی ہونے کے نتے آج جب میں انہیں یاد کرتا ہوں تو پتہ چلتا ہے بچپن کی کچھ دھنسنے والی دھنندی سی بادوں، نستھن میں ایک سینہ کا ساتھ، سال میں ایک یاد دبارہ آنے والے ان کے خط اور ان کے بارے میں ان کے دوستوں سے سنی جاتی ہاتھوں کے سوائے میرے فام میں کچھ بھی نہیں ہے۔ دو ملکوں میں بے ہوئے بھائیوں کی کل کائنات یہی ہے۔ صرف دو ملکوں کے درمیان سے نہیں گزرتی بلکہ رگوں میں رفتار نے والے ایک بھی خون کو بھی کاٹ دیتی ہے۔

بچپن کی دھنندی دھنندی یا فعل کی مدد سے جب میں اپنے ذہن میں ان کی شبیہہ بنانا پاہتا ہوں تو وہ جسوس ہوتا ہے کہ جسے وہ بچپن میرا نہیں کی اور کا تھا اور جو شیہہ میرے ذہن میں بن رہی ہے وہ جلیس، صاحب کی نہیں کسی اور کی ہے۔ زندگی کا دد مرحد بڑا کربناک ہوتا ہے جب اُوپی کا اپنا بچپن خود اسے اجنبی دکھانی دے۔

میرے ہوش سینھانے کے جلیس صاحب گلبرگہ ہائی اسکول کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد علی گلڈ ڈیپلے ٹیکنیکال الجمنی گریجوں کی تھیں میں وہ گلبرگہ آیا کرتے تھے۔ مگر خاندان دلوں کے لیے ان کا آنا دادا نا برا بر ہوتا تھا۔ کیوں کہ وہ دوستوں نے رسایا تھے۔ ہر دم دوستوں کے تھیں میں گھرے رہتے تھے۔ اور گلی کی تھیں اپنے دوستوں کے ساتھ گز اُرپنیں بُرد داں پر چلے جاتے تھے۔ والد صاحب کی خواہش تھی کہ وہ تعلیم سے فارغ ہو کر سیوں سو روپیاں کا مستحکم دادا پر

پہنچو جائیں لیکن انتہمیہ دیت کے طالب علم ہی تھے کہ انھوں نے پہلا افسوس لکھ کر سیول سردوں کی ساری ذمہ داریوں سے بُلک دو شیخ اختیار کر لی اور دالد صاحب نے چبے جاپ اپنی خواہش کو واپس لے لیا۔ دالدین بہت سے کام یوں ہی خاموشی کے ساتھ کے جلتے ہیں اور دالد کو اپنی خواہش کا علم نہیں ہونے دیتے۔

بچپن کی یادوں میں ایک یاد میرے ذہن میں بہت نمایاں ہے کبھی کبھار جلیس صاحب کو دوستی سے فرصت ملتی تو خود ان کے مچھوٹے بچوں کو جھوٹی کی کہانیاں سنائیں رہتے تھے۔ یہ ان کا غوب مشغله تھا۔ انہیں جھوٹوں کی ایسی خوف ناک کہانیاں پڑھیں کہ انھیں سن کو دریہ کی ہڈی تک لرز جاتی تھی۔ اکثر کہانیاں خود ان کے ذہن کی پیداوار بڑی حصیں کی رکھتے ہو کر رہتی ہیں مگر یہ کہانیاں کہیں پڑھیں نہ سمجھیں۔ یہ ان کی اقسامہ نگاری کا فطری آغاز تھا۔ ان کہانیوں کی مشترک خصوصیت یہ ہوتی تھی کہ ان میں ایک خالی بھرت ہوتا تھا اور ایک مظلوم آدمی۔ اگرچہ کہانی کے آخری وہ مظلوم آدمی کے ہاتھوں ہی اس ظالہ بھوت کا خاتمہ کرتے تھے۔ لیکن ظالم بھوت کے ظلم کی تفصیلات اور مظلوم آدمی کی جدوجہد اور جو سب سے کوہہ ایسی ایڑا نگیری کے ساتھ بیان کرنے تھے کہ ہم دم بخود رہ جاتے تھے۔ جب کوئی خوفناک کہانی سنائیتے تو بچوں کے چہروں کو دیکھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کرتے تھے کہ کوئی لکھاڑا نہ رہتا۔ کوئی بچہ زیادہ درختا ہتا تو ایک زور دار تھقہہ لگا کر کہتے تھے اُسے یہ تو صرف کہنی ہے۔ اس میں ڈلنے کی کیا بات ہے۔ یہ بھوت آئے ہوا تو میں اس کا مقابلہ کر دیں گا۔ میں اکیلا ہی دنیا کے سارے بھوتوں کا مقابلہ کر سکتا ہوں لا ان کے ان جسموں سے ہمیں بڑی بہت بیٹھتی تھی۔

جلیس صاحب زندگی بچہ بھوتوں سے رہتے رہے اور ظالم کے خلاف مظلوم کی حیات کرتے رہے۔ یہ بات ان کی قدرت میں بنیادی اہمیت رکھتی تھی۔

ان کی ایک نادیت یہ بھی تھی کہ ہر کام میں جلد بازی دکھاتے تھے۔ وہ لگاتا تھا جیسے ان کی رُگوں میں خون نہیں پارہ دھنڈتا ہے۔ جذباتی انسانوں کا خون اکثر یوں ہی پارے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ زندگی کے ہر کام میں انھوں نے محبت کی۔ ابھی ملی گذھ یونیورسٹی میں زیر تعلیم بھی تھے لہو انسان نگاری حیثیت سے سارے ہندوستان میں مشہور ہے جیکے تھے۔ میرے سب سے بڑے بھائی مجبور حسین جنگر ابھی گریجویشن بھی نہیں کیا تھا کہ یہ علی گذھ سے گرجوٹ ہو کر لگبرگر کو واپس آئے۔ حالانکہ بھائیوں میں ان کا غیر تیسرا اجھا۔ ۲۰ سال کی عمر میں ان کے انسانوں کا پہلا محسوسہ ”زرد چہرہ“ شائع ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ انسانوں کے اپنے پہلے مجبور حسین کی کچھ کا پیال لے کر لگبرگر آئے تھے۔ جب انھوں نے اس کتاب کا ایک نسخہ دالد صاحب کی خدمت میں پیش کیا تو جلیس حفظ کی آنکھیں حسب کی ہوئی تھیں۔ جیسے انھیں سول سویں کا اتحاد نہ ہمیں کا دکھ ہو۔

جلیس صاحب باعثی اور سرکش ادیب تھے۔ لیکن جب وہ دالد صاحب اور میرے سب سے بڑے بھائی مجبور حسین جنگر صاحب کے رو برو ہوتے تو ان کی ساری بغاوت، ساری سرکشی اور ساری شکفتہ رازی کا فرہر جاتی تھی۔ ان دونوں شخصیتوں کے ساتھ ان کی آنکھیں سہیش جھکی ہر دو ہوتی تھیں۔ بات بھی دوچار بھلوں سے زیادہ نہیں کرتے تھے اور اسے پاؤں پل پس اگر پھر بغاوت اور سرکشی سے ہم کنار ہو جاتے تھے۔ پس قوی ہے کہ ان کے کردار کی تربیت انہی دو شخصیتوں کی مر جوں منت بھی۔

میرے والدے جب انہیں ایک اقسامہ نگار کے بعد میں تسلیم کر دیا تو انھوں نے دوڑا تدرشی کے طور پر یہ فیصلہ کیا کہ ان کی شادی کس مالدار گھر میں میں کی جائے چیز پر جس سال ان کے افسوس کا پہلا جھوڑ شائع ہوا۔ اسی سال ان کی شادی گلگر کے ایک نہایت متھل اور مال مار گھر اسے میں ہوئی۔ مگر گلگر کی خیری بلڈنگ میں ان کی شادی کی دھنی دھنی دھنی سی یادیں اب بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ وہ فظر شا دلت، عیش دار امام احمد خاز دلی

اور اس فضائل کی دلیل روزانہ مصروفیات سے بال محل بنتی نظر تھے۔ لہذا چند ہی دنوں بعد وہ اپنی ادبی مصروفیات میں الجھ گئے۔ جلیس صاحب کی زندگی کے بارے میں اب سوچنا بہل تو احساس ہوتا ہے کہ وہ پھر ان کے بیوی درودہ تھے۔ لندن گئی میں جب کوئی بھرا، نہیں، ہزا تھا وہ ایک بھراں پیدا کر رہتے تھے۔ وہ بھراں کے بیٹھنے زندہ بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کی زندگی میں دو چھڑیں بھیتھیں۔ ٹلو فان یا طوفان سے پہلے کی ناموشی۔ اور دنیا میں بیست کم لوگ اپنے جذبہ کی سطح تک پہنچ کر زندہ رہتے ہیں۔ مگر جلیس صاحب اس سطح تک پہنچ کر زندہ رہے۔ جذبہ نے ان سے بڑکھا اکھروں نے وہ کرد کھایا۔ یہی دیر ہے کہ زندگی کی یکسانیت کو وہ کبھی برداشت نہ کر سکے پہنچتے اینے جذبہ کے ساتھ ساتھ چھتے رہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی وہ کسی ملازمت سے دوسال سے نیا نہ دا بستہ رہے ہوں۔ کچھ مہینوں کے لیے وہ حیدر آباد کے ایک سرکاری مکتبہ کے پہلی فلی افسرس بھی رہے مگر اس مکتبہ کے ذریعے لہڑکار اخنوں نے اس ملازمت کو جھوٹ دیا۔ وذریوں اور سرمایہ داروں سے لڑانا ان کا محبوب مشغله تھا۔ انہوں نے فطرت ہی کچھ ایسی پائی تھیہ ہمیشہ اپنے سھا قلت داد دی سے شکر لیتے تھے۔ اور وہ اکثر اس لڑائی میں فتح بن کر خودار ہوتے تھے۔ ان کے یاس اس فتوحات کے ساتھ بھی نہیں تھا۔ یہی ان کی زندگی کی کمائی تھی۔ چند دن فلی دنیا میں قسمت آزمائی کرنے لگئے اور ساحر لدھیانوی کے ساتھ بھی کی سرکھوں کی خاک جھانی۔ ان میں صبر کا مادہ بالکل نہیں تھا۔ لہذا چند ہی دنوں میں بھی کے فلم سازوں سے لڑائی کروائیں چلے آئے۔ عالمی زندگی میں ان کا عال اس بھیت کا ساتھا جو ریت کے گھر زندہ بنا بنا کر توڑتا جاتا ہے۔ اور کبھی کسی گھروندت سے مٹھن نہیں ہوتا۔ انہوں نے جو کچھ کہا یا اپنے قلم سے کہا۔ فیرت اور خودداری کا یہ حال تھا کہ کبھی اپنی بیوی کی جبا سیداد، ان کی دعوت کی طرف آنکھے اٹھا کر صبی نہیں دیکھا۔

ان کے لکھنے کی رفتار حیرت انگریز تھی۔ اپنا شہر ناول چالیس کروڑ بھکاری ۱۰ مخنوں نے آٹھ دس دن کے اندر لکھا تھا۔ بھیس برس کی ہماری میں انہوں نے ایک ادیب کی حیثیت سے دہ شہر حاصل کر لی تھی جو بہت سوں کو بچا سی برس قلم لکھنے کے باوجود وہی نہیں ہوتی۔ وہ جب ادیبوں سے بھی لپھتتے تھے تو اس احتیاک کو بطور خاص ملحوظ رکھتے تھے کہ جس ادیب پیدا کیا جائے وہ چوتھی کا ادیب ہو درستہ لکھنے کا فائدہ ہی کیا ہوا۔

۱۹۴۸ء میں وہ زندگی کے ایک بہت بڑے بھراں سے گزرے اور ایک دن خاندانِ والوں کو پستہ چلا کر وہ ہندوستان سے چلے گئے ہیں۔ والد صاحب کو پورے دو میتوں بعد ان کے ہندوستان سے چلے جانے کی اطلاع ملی۔ کمی دفن تک پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہیں ادا کیا کر رہے ہیں۔ پھرستہ چلا کر وہ لاہور میں کسی اخبار سے فاہستہ ہو گئے ہیں۔ پھر چند ہی دنوں بعد ان کا مشہور پورٹ فاؤنڈنگ نکل ایک کہانی "چک" کرتا۔

جلیس صاحب کی یہ رہکتاب سے جس میں انہوں نے نہ صرف اس رصیف کو تقسیم کرنے والی سیاست سے متعلق تھی۔ بلکہ اپنے آپ سے بھی متعلق تھی۔ یہیں انہوں نے اپنے لٹٹے چھوٹے دھونکو بڑے جتن کے ساتھ پھر سے جوڑا تھا اور بڑا ہی بے باک اسہ اور بے جھلکی کے ساتھ اپنے آپ کو بھی نشانہ ملامت بنایا تھا۔ یہ کتاب اور وہ کیے تو اس رصیف کی تاریخ کے ایک سنگین حصہ کی دستاورد ہے لیکن خود جلیس صاحب کیے ہے یہ کتاب "ترزکیہ نفس" کی حیثیت رکھتی تھی۔ اسی کتاب کے ندیعہ انہوں نے اپنے دل میں چھپے ہوئے کا نٹوں کو چن چن کر باہر نکالا۔ اس کتاب کے بعد وہ پھر ایک بار چنان کی طرح سنبھو طبن گئے اور نئے تجربوں سے ملک لینے کے نکل کھڑے ہوئے۔

جلیس صاحب کی زندگی کے دو دن بڑے کھنچتے تھے۔ نیالک، نئی سرزین، نئے لوگ، اسی حالات میں اپنے یہ جگہ بنانا

ان کے لئے کتنا دشوار تھا۔ مگر وہ بہت بارنا جانتے ہی نہ تھے۔ ان کے بچے اور بیوی برسوں پہلی ہندوستان میں رہے، وہ بیوی بھی اور اپنے والیں، اپنے رشتہ داروں اور اپنے احباب کے لیے تردیتے رہے میکن بھی ماں وس نہیں ہے۔ لفڑت والٹ گھوٹ، اور انسانی و قسم نظریات کے خلاف انہوں نے پدستور اپنی جنگ جاری رکھی۔ اس ضمیمی وہ جمل بھی گئے۔ والد صاحب کو جب پاکستان پر ان کی گرفتاری کا بیان چلا تو وہ اس اطلاع سے یوں خوش ہوئے جیسے ان کی کوئی درینہ خواہ نہ پوچھی ہوئی پرانی نسل کے لوگ بھی کیسی کسی یا توں پر خوش ہوتا جانتے تھے۔ اندراج ہماری خوشیاں کتنی مختلف ہیں۔

جبل میں ہی انہوں نے اپنی مشہود کتاب "جبل کے دن جبل کی ملائیں" لکھیں۔ لیکن سچاں کو نیا دن دلفن کمک صلاحوں کے پیچے بند ہیں رکھا جاسکتا تھا۔ وہ جبل سے باہر آئے تو قائم بن چکے تھے۔

وہ روزنامہ "جنگ" میں طنزی کالم لکھا کرتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے افسانہ نگاری سے کم ویسٹ گنارہ کی اختیار کر لی۔ اور ایک صحافی کی حیثیت سے شہرت کی نئی منزلیں طے کرنے لگے۔ سابق صدر امریکہ لندن میں جانش کی شخصی دفتر پر امریکہ گئے جیسی کی سیاحت کی، ماوزے تھنگ سے طے، روسری گئے، مشرق وسطی گئے، یورپ گئے، مشرق یورپ گئے۔ عزوف دینا کے ہمراں کی سیاحت کی۔ چار سال پہلے وہ ہنگ کا ہنگ جاتے ہوئے چند گھنٹوں کے لیے دلی کے ہوالی اڈہ پر بھی رکے۔ وہ جوانستہ تھے کہ وہ اپنے ایک بھائی سے چند فرلانگ کے فاصلہ پر ہیں۔ لیکن عملاً یہ فاصلہ کتنا میسا تھا۔ انہوں نے صرف اتنا کیا کہ ایک خط لکھ کر دلی کے ہوالی اڈہ پر پوست گروپ اور اپنے سفر پر رفاقت ہو گئے۔ وہ زندگی کے سفر میں رکتا اور پڑھ کر دیکھا جانتے ہی دفعہ سفر یہی ان کا نسب العین تھا۔ پاکستان جا کر بھی انہوں نے علی زندگی کے بارے میں اپنا انداز نہیں بدلا۔ ہر دوسرے تیسرا سال وہ کوئی نئی لازمتوں ڈھونڈ لیتے تھے۔ اخباروں میں طنزی کالم لکھے، فلمیں بیانیں، روزنامہ انجام کے ایڈیٹر بنے اور اپنا ذاتی اخبار "عوامی عدالت" نکالا۔ آخر وقت میں وہ روزنامہ "مسافات" کے ایڈیٹر بن گئے تھے۔

ستمبر ۱۹۶۷ء میں وہ ایک تھیٹر کے لیے حیدر آباد آئے تھے، حیدر آباد سے اپنی بیوی پیار تھا۔ اسی تھیر میں انہوں نے شہر کی ابتدائی منزلیں طے کی تھیں۔ یہیں سے اپنے باضابطہ ادبی سفر کا آغاز کیا تھا۔ اسی شہر کے لگنی کوئی بھی میں ان کی جوانی بھی تھی۔ یہیں انہوں نے مستقبل کے سہماں خواب رکھتے تھے۔ حیدر آباد کے احباب اور حیدر آباد کے لوگ ان کی سب سے بڑی کم زدی تھے۔ ان کی آمد کے موقع پر جب حیدر آباد میں جلسہ ہما تو ادب دوسوں کا ایک سیلاب تھا جو امداد آیا تھا۔ وہ اس والہانہ محبت کو اپنے دل میں سمجھنے پڑ پڑا پاکستان لوٹ گئے۔ جاتے ہوئے کہتے تھے۔ دو تینی سال بعد میں بھیرا کیا ہے؟ سترہ برس بست گئے مگر وہ پھر کبھی نہ آئے۔ زندگی کی جدوجہد نے انہیں پھر مہلت ہیا تھی۔ جاتے ہوئے بھی ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ رعنایا ملک نہیں جانتے تھے۔ حالاں کہ وہ اپنے شہر نگاراں کو بیدار ہمیشہ کے لیے چھوڑ رہے تھے۔

یہی نے جب ۱۹۶۸ء میں مذاق نگاری شروع کی تو وہ اس اطلاع پر بے حد فوشن ہوئے تھے۔ یہ دے پیار کے ساتھ انہوں نے میرے پہلے مصنفوں کی تعریف میں خط لکھا تھا۔ وہ خط لکھنے کے معاملے میں غائب نہ لای رہا تھا۔ سال میں دو ایک بار عطا لکھ کر اپنی خبریت کی اطلاع ہم لوگوں کو پہنچ دیا کرتے تھے۔ ان کا آخری خط میرے بڑے بھائی سمیوب حسین جنگ کے نام آیا تھا۔ وہ خط میر پڑھ لے کر کھا گیا تھا اس خط میں بہت سی خانگی باتیں کرنے کے بعد میرے بارے میں ایک جلد یہ کھا تھا۔

غرنے سے پہلے کرشمچندر کا ایک خط ۱۹۶۸ء فروردی کا لکھا ہوا تھا۔ جس میں لکھا تھا — ادھر ہند میں جتنی نے دھوم پھاڑ کر ہے۔ چشم پر دوسرے — جندر ڈھونڈ کر دل کی دل میں سترت سے محدود ہے۔

جلیس صاحب نے یہ خط مجھے حیر دیا تھا۔ ان کی مسٹریت کے خیال سے میں بھی کئی دن مسرو درہ بھی کیوں کیں۔ انھیں کسی اور طرح مسٹر نہیں پہنچی سکتا تھا۔ ہم لوگوں کے درمیان اب ایسی ہی جھوٹی موثقیتیں رہ گئی تھیں۔

جلیس صاحب نے اپنی زندگی کے بہت سے کام جید ہی کر ڈالے تھے۔ شاید انھیں پڑھا کہ کار جہار بہت زیادہ دعا زندگی کا۔ مگر انھیں اپنے فائدہ ان کے بیے بہت کچھ کرنا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ذاتی خوش حالی کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ دہلی گورنمنٹ کے ماتحت پہلے کرنے تھے۔ انھیں اپنے گھر سے دعا کرنا تھا۔ وہ ساعت اور انسائینٹ سے دابستہ کاموں کو روپا کرنے کے بعد اپنے گھر کی طرف تو میر دینا چاہتے تھے۔ لیکن یہ راستے میں ہی زندگی کی شام آگئی۔

وہ زندگی بھر جبراںوں اور طوفانوں سے گزرتے۔ ہم لوگ ان کے بھراںوں سے ہمیشہ بریشان رہتے تھے۔ لیکن سماں تک ساختہ یہ لیکن بھی رہتا تھا کہ وہ ان بھراںوں پر قابو پالیں گے، اکتوبر ۲۰۲۵ء میں یہی ہوتا اکرم با تھا۔

ان کے انتقال سے تینی چار دن پہلے ہندوستان کے اخبارات میں ان کی پریس کانفرنس کی پورٹ جھپٹی تھی جس سے پستہ چلا کر پاکستان کی فوجی حکومت نے ان کے اخبار پر تبعض کر دیا ہے اور یہ کہ ان کا اخباراب شائع نہیں ہو گا۔ اس خبر کو پڑھ کر تشویش ضرر ہوئی تھی مگر یعنی تھا کہ وہ حسب سعمل اس بھرمان سے فتح یا پور کرنے کیلئے گے۔

۲۴ راکٹوں کو جبکہ جلیس صاحب کو اس دنیا سے رخصت ہوئے ہوئے، ۲۵ نجفیتی بیت چکے تھے۔ اور ان کا جسد خالی میوں میں کے بو جھ تک دب چکا تھا جیسے "ٹائمس آف انڈیا" کی خبر سے پستہ چلا کہ ارفن دکن کے پامی ادیب نے سندھ کی وادی میں اپنا پڑا دوڑاں دیا ہے۔ دو بھائیوں کے بیچ Communication کا ہی ایک سنگین ذریعہ رہ گیا تھا۔ ان کے انتقال سے دو ملکوں میں رہنے والے بھائیوں کے درمیان بی بی سی جو ایک کہانی پچھلے ۳۹ برسوں سے جاری تھی وہ ہمیشہ ہمیشہ کے سے ختم ہو گئی۔ کہانیاں یوں ہی زمانہ اور تاریخ میں بکھر جاتی ہیں۔ مجھے جلیس صاحب کی وہ بھجوں دالی کہانیاں بہت یاد رہیں جن میں وہ ہمیشہ مظلوم کے احتجاج کا خاتمہ کر دیتے تھے۔ جب تک کہانیاں ان کے تبعضہ قدرت میں رہیں۔ کبھی بھجوں کو یہ موقع زمل کا کہ وہ مظلوم کا خاتمہ کر سکیں۔ مگر جلیس صاحب کی بھروسی یہ تھی کہ وہ خود اپنی زندگی کی کہانی کے فانہ نہیں بیسکتے تھے۔ جبھی تو ان کی زندگی کی کہانی کا انجام دیا نہیں ہوا جیسا کہ ان کی تکمیل ہوئی کہانیوں کا ہوتا تھا۔ اس دنیا میں یہ تکمیل ہی نہیں کہ ایک کہانی کا اپنی مرہنی سے اپنی زندگی کی کہانی کے انجام کا فیصلہ کرے۔

نامور طنز و مزاح نگار شاعر

رضائقوی و احمدی متعالہ کے کلام کا دلپذیر مجموعہ — متعالہ

صفات ۳۲۸

مجلد اولہ فوبصت ڈسٹ کر کے رائٹر قیمت بیس لاکروپیہ بتوسط بٹگوڈ،

ماں تباہ

ہم خاک شیوں کی

ایک تاثر

ابراہیم جیس زمیں کے آدمی تھے۔ اسی کے قدم پہشہر زمیں پر بیٹھے رہے۔ انہوں نے آخری سانس تک زمین پر بیٹھنے والوں کے درد کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ دوسرا بات پسے کہ وہ ایک خوش حال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ لیکن انہوں نے کچھ اپنی خوش حالی کی صورت سے دوسروں کی تباہ حالی کو نہیں دیکھا اور وہ اپنی خوش حالی کو خود کے لیے باعث اعزاز کھانا۔ اسے وہ محض ایک اتفاق سمجھتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ وہ آسودگی کے تحفے از کر زمیں پر آگئے اور خاک شیوں میں مل کر ان کی آواز میں اپنی آواز کو بھی شامل کر لیا کہ ہم خاک شیوں کی شکوہ پر زمانہ ہے!

یہ پویس ایکش سے پہنچے کا وہ زمانہ ہے جب جلیس علی گڑھ یونیورسٹی سے گریجوشی کی ذگری لے کرنے ارادوں اور نئے جو سلوں کے ساتھ حید را بادائے اور میں اپنے فالد کے انتقال کے تیسرے دن مانی اسکول کا متحان جھوڑ کر حید را باد آ رہی۔ سرپیس ہارسس ڈپلمیر کورس میں بحیثیت سو فور کلک بھرتی ہو گیا۔ قدرت نے ہم دوتوں کو الگ الگ راستوں پر ڈالا تھا۔ لیکن ایک قدر ہم دو فرمانی مشرک تھی اور وہ قدر تھی انسان سے دوستی کی اور اس سے بے پناہ پیدا کی!

جلیس صرف عمر میں نہیں بلکہ قابلیت میں بھی بڑے تھے۔ لیکن اس کے باوجودہ ہمیں ملاقات میں وہ بھروسے ہوں ملے جیسے میں اور وہ ایک ہی اسکول، ایک ہی یونیورسٹی، ایک ہی محلے اور بھلی کے ساتھی ہیں!

بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ تھیقہ لگایا۔ اور قسمی سڑیت آؤ کی —

مسلم ضیافت کے کمرے سے لے کر نظر میرہ ہڈل تک جلیس کا۔ یہی حال رہا۔ جب بھی ملتے تھے گاتے ہوئے، اپنی اوپنی آداز میں باتیں کرتے ہوئے، بیٹھنے ساتے ہوئے، اور خود اسے بڑھ کر ہڈل کا بیل ادا کرتے ہوئے۔ یہر حال انہوں نے کبھی بھی احمدگوہ قت بھی بھجھے یہ نہیں۔ ہر نئے دیا کہ میں کسی طرح بھی ان سے کم ہوں۔ بلاشبہ یہ جلیس کی بڑائی تھی اور بڑے آدمی کی نشانی یہی ہوتی ہے کہ وہ دوسرے کو بھی مصادی درجہ دیتا ہے اور اپنے برابر سمجھتا ہے ورنہ چھوڑنا آدمی ہر دقت میں میں اور تو تو کی چیز میں لگا رہتا ہے! ۱۹۳۸ء سے ہیں سے اُنھا شروع کیا۔ اور سی ۱۹۴۸ء میں میری کہاں نکل کا پہلا جو موہفہ قفت پامحمد کی شہزادی " کے نام سے من

وہا۔ اس وقت تک جلیس کی شہرت انسان نگاری کی حیثیت سے سارے ملک میں پہنچی تھی۔ ایسے میں جلیس کے مقابلے میں دوام کے ساتھ اور ادبی مکملیں میں وہی کہانیوں کو پیش کرنا بڑی بات نہیں تو کوئی جموں بات بھی نہیں تھی۔

خداوم کے بعد دوسرا تھیت جلیس کی تھی جو حیدر آباد کی ادبی اور تہذیبی زندگی کا ایک اہم گردان تھ۔ لیکن ترقی پر مصنفوں کے جلیسوں میں کمی تباہ انضیل نے اپنی نے ساتھ ساتھ کہانیاں پڑھیں۔ بحث بھانسے ہوئے سنت لفست لو ہو ہوئی۔ لیکن جلیس دوسری بھی ملاقات میں آگے بڑھ کر با تھہ ملا تھ۔ بلکہ سطھ ملتے۔ بالکل اسی طرح جس طرح دو دیگر عدالتیں بھائی کے مقابلے میں بحث کرتے ہیں۔ جھجکر کر کرے ہیں۔ لیکن جب باہر نکلتے ہیں تو اتحاد میں ہاتھ دئے ہوئے ہوئے! سکراتے ہوئے!

وہ پیارہ بھی کیسا پیارہ بھا۔ اور وہ مخالفت بھی کسی خالع نہ تھی جس میں شرافت کا دامن بھی ہاتھے نہیں، جھپوتا تھا، آج جب جلیس کے بارے میں سر جا ہوں تو یادوں کا ایک قائمہ فلک درون کے ساتھ گفر جانا ہے۔

نظامیہ ہوشی!

مسلم ضیائی کا کرو!

اور سید محدث قادری اٹھی طرفہ کا گھر!

دو سخن کا بھوم، جلیس ان میں گھرے ہوئے — ماجد، شمس الدین فاندقی، عین الدین کولکاسی، سید احمد احمد قادری، سید احمد احمد قادری، محمد علی تیر، افہر رضوی، مسلم عہدی، قرساحی، شبرا، شفقت رضوی، اور جانے کتنے نام اور کتنے چھرے۔

اب کچھ بھی تو یاد نہیں آتا!

صرف جلیس کا چھرہ ابھرتا ہے۔ اس اراہیم جلیس کا جس نے لپٹے وطن حیدر آباد کو چاہا ہی نہیں بلکہ حیدر آباد کے ہر ادیب اور شاعر کا بڑے فرشتے ذکر کیا۔

بھی جلیس کی بھی اپنے زندگی۔ حدود حیدر آبادی تو سو شہر خود کو دوسروں کے حوالے کر دیا ہے اور آتنا احساس کم ترقی کا شکار رہتا ہے کہ سر اٹھا کر بات نہیں کرتا۔ لیکن جلیس نے ایسا نہیں کیا — اپنی ادبی، تہذیبی اور صحفی زندگی میں بھی اور ذاتی زندگی میں بھی — یہی جلیس کی انفرادیت تھی!

میں اس سے ہٹ کر جلیس کی زندگی کے دوسرے چہلوں سے باقاعدہ نہیں ہوں۔ اور زندہ جانا ہوں کہ جلیس نے اپنی بھی زندگی میں کیا کیا۔ لیکن اتنا حضر در جانا ہوں کہ جلیس نے اپنے قلم سے سیکار کا کام بیا!

یک پوچھیے تو جلیس کے ہاتھ میں قلم نہیں تھا بلکہ ایک بندوق جو سخت طالب اور قابل کو اپنائتا۔ بنائی تھی لیکن ایک لمحہ ایسا بھی آیا کہ جلیس کافٹ نہ جوک گیا!

اس طوفان میں ایک جلیس کا کیا ذکر اچھے لچھے متازیں تکریز ہن کے دلک بھی بہر گئے۔ اکثر ادیب اور شاعر تندید ہند باتیت کا شکار ہو گئا رچ پاسٹ کرنے لگے۔ لیکن اسی وقت بھی چند اس ان حدود ادیب اور شاعر باتی بچے تھے جو ان نے خود کو الک رکھا۔ ان میں سلیمان ادیب، قرساحی، اختر حسن، عبدالعلی خاں، محجوب حسین جگر، ڈاکٹر صینی شا بدرا، ڈاکٹر زیریت ساہید، احمد اکرم عالم خوندیری قابل ذکر ہیں!

میں بھی ان میں سے ایک تھا!

اُج وہ ادیب یا شاعر جو ادیبی اور صحفی آداؤں میں ادب کر رہا ہے اس وقت پیدا ہیں ہے تھے۔ با اگر پیدا ہوئے بھی

تو ہبھو جانتے تھے کہ ادب یا فن کا کسی گرامی کو کسی چورا۔ ہے پرلاکر تمجید دیتا ہے اور ادب بھی ایسے نسلک پومنیں باقی ہیں جیسے کے کے نئے بیخود کر ادب، آرت اور فن کے مسائل پر بات کرتے ہیں۔ اور ہمیں جانتے کہ جب غنی کار سی بھول کا شکار ہو کر شدید جذباتیت کا انہمار ادب میں کرنے لگتا ہے تو ادب کا کامی حشر ہوتا ہے!

میں اس تعلق سے کچھ ہمیں کہوں گا۔ کیونکہ ہم سب اس سے فاقع ہیں۔ لیکن آناضور کہہوں گا۔ علیس میں ہندوق دالے قلم کو کہ جہاں ہبھاں گئے وہاں دہلی انسیں نے سینکڑوں انسانوں کو متاثر کیا۔ جلیس کے قلم میں بے پناہ طاقت تھی۔ وہ اپنے تیکھے اور چھٹے کو طنزت، جاگیر دار امام اور سرمایہ دار امام قائم کے خلاف آخر دم تک رہتے رہے۔

زندہ بھرے ہوں یا چالیسوں کرہ بھکاری یا جور بازار یا ان کی کوئی کتاب اٹھائیجئے اس میں ان کا جھٹا ہوا طنز اجر کر اپنے پڑھنے والے کے دل درماغ کو اس طرح متاثر کرتا۔ ہے کروہ مصنف کے ساتھ زندگی کی ان تلحیخ اور بے رحم حقیقتوں کے بارے میں سوچنے لگتا ہے جس پر اس اندھستے اس کی نو پیہے کبھی نہیں گئی تھی!

ادب کے ایجاد میں ابراہیم جلیس، کی آواتریہی ادا نہتے جو پڑے اعتماد اور پُر فقار اماماز میں گوئی اور لاکھوں سنتے والوں کو اپنا ہم خیال بنت کر سہیش کے لیے چپ ہو گئی۔ لیکن کیوں؟

اس کا جواب کہنی نہیں دے سکتا۔ ناک شینیوں کی وکالت کرتے کرتے چکے سے خاک میں سوچانے والے دکیل ابراہیم جلیس کو کیا اس بات کا پتہ ہے کہ پہلے سے کہیں زیادہ اب عالم کو ان کی صورت ہے۔ یہی وکالت ہے جو مقدمہ جتنے سے پہلے ہی سوچی۔ اگر ایسا ہی تھا تو پھر مفت دہر لیا کیوں؟

اب جایب دو دکیل صاحب! یہ کسی وکالت ہے آپ کی!

اگر تھک گئے تھے قوام سے پہلے اتنا تو کیا ہوتا کہ مقدمہ کسی دوسرے دکیل کے حوالے کر دیتے!

8

”جس دن ”عزت آب“ یا میں ذیری صاحب کے ذمہ مقدمہ کئے جانے کی خبر سرکاری طور پر آئی۔ اس دن ”عزت آب“ کے صاحب زادے گھر میں ناجائز کرنے لیج کر

ایا جان ————— بادشاہ ہو گئے

ایا جان ————— بادشاہ ہو گئے

”عزت آب“ کو غصہ آیا تو انہوں نے ایک بچے کو پکڑ پیندا شروع کیا۔ یعنی صاحب نے زپ بجا د کیا اور کہا،

”بچے کو کیوں مارتے ہیں آپ — ؟ معموم بچے کی زبان مبارک ہوتی ہے۔

آج ذمہ ہوئے ہو، کل بادشاہ بھی ہو جاؤ گے۔“

(کتاب ”درستک ایک کہانی“ سے)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آمِنَہُ الْوَاعِدُ

ب سے پہلے میں نے ابراہیم جلیس کی آواز دکن ریڈیو سے سنی۔ اور اس آواز کے جوش و خروش نے مجھے سے کہا: یہ ضرور کوئی خاص شخختیت ہے۔ تب تک میں نے ان کی کہانیاں نہیں پڑھی تھیں: ہی ان کی شکل سے متعارف تھی۔ میں اس وقت اتنی باشمور بھی نہ تھی کہ اسی جوش و خروش کا میسیح مسیح مفهم اور دندنائک جانپ لیتی۔ پھر بھی ایک خواہش میرے ذہن میں جاگ گئی کہ اس آواز کی بابت ضرور پرچھتا پڑھ کر دوں۔ اور جب مجھے پتہ چلا کہ وہ ابراہیم جلیس کی آواز ہے جو کہانی کا رجی ہیں تو میں نے مخصوص کر کر ان کی کہانیاں پڑھیں۔ پھر قویہ سہوا کہ جہاں اور جس رسالے میں ان کا نام نظر آیا میں نے کبھی نظر انداز نہ کیا اور ان کی ہر ہر تحریر پڑھ دیا۔ یوں زندگی کے وہ بہت سے روپ جو اس وقت تک میرے ذہن کی نظروں سے او محفل تھے ان کی کہانیوں اور تاویلیں کے کرداروں کے ذریعے آجائی ہونے لگے۔ ان کی سچائیاں، ان کا تیکھا پن میرے اندر دن میں محفوظ ہوتا گیا۔ میرا جی چاہا کہ میں جلیس صاحب سے فوراً ملوں یکن اس زمانے کے اپنے گھرانے کے دسترد کے مطابق میرا ان سے ملینا آسان نہ تھا۔ میں کسی مناسب مرتبے کا انتظار کرنے لگی مگر اس موقعے کے آنے سے پہلے ہی معلوم ہوا کہ جلیس صاحب ترک ملن کر گئے۔ بہت رنج بہت افسوس ہوا۔ میری ایک خواہش ناتمام ہو گئی۔ بہت سا وقت گزر گیا مگر وہ آرزو دمری نہیں میرے اندر بلا بر ساریں یافتہ ہی۔ پھر میں بعد جیسے ہی میں نے سُنا کہ جلیس صاحب پاکستان سے حیدر آباد آئے ہوئے ہیں تو میں خود کو روک نہ سکی۔ اس وقت تک میرا بیاہ ہو چکا تھا اور ایک کنوواری لڑکی کے لئے جو بندشیں ہوا کرتی تھیں وہ بہت کچھ کم ہو چکی تھیں۔ چنانچہ میں اپنے اشتیاق سے مخلوب ان سے ملنے چل پڑی۔ جب میں اخبار سیاست کے سابق وزریں داخل ہوئی تو جگر صاحب نے فوراً پوچھا:

”جلیس سے ملنے آئی ہو۔؟“

میں نے کہا۔ ”جی ہاں۔“

جگہ صاحب نے ایک کرے کی طرف اشارہ کر کے کہا : " اس کرے میں چل جاؤ :

اور میں بے اختیار کرے میں داخل ہو گئی۔ کافی لوگ پیشے ہونے تھے، پھر بھی میں نے جلیس صاحب کو فوراً بچاں دیا۔ ذکر چہرا، ذوبی ہوئی آنکھیں، لکھتے ہوتے میکن مخاطط ملود پر جائے ہوئے انداز۔ میں نے بلا تکلف سلام کیا اور جیسے بھی مجھے لگا اس چھوٹے سے کرے میں اس وقت کتنی وسعت اور کشادگی پیدا ہو گئی تھی جیسے اعماق سے بلبریز صرف دو افراد نہیں بلکہ دو لاک اس نہیں سے کرے میں سما گئے تھے اور درمیان میں کوئی دیوار نہ تھی، خوشی سے میری آنکھوں میں تھوڑی سی نمی تیری۔ مجھے ہندوستان اور پاکستان کے دل وسعت کے جنم میں دھڑکتے محسوس ہوئے۔ میں نے چکے سے اپنی آنکھیں پوچھیں اور میرے سوال کے جواب میں جلیس صاحب نے بتایا کہ کہاں یوں اور یا توں کے لئے اب ان کے پاس وقت نہیں۔ صحافت اور ادب میں بہت فرق اور فاصلہ ہوتا ہے اور میں ہنس پڑی۔ لکنا سفید جھوٹ ہو سکتا ہے کہ جلیس صاحب نے عرصہ سے کوئی کہاں نہ لکھی ہوا اور آئندہ عرصے تک نہ لکھ سکیں میکن دیکھنے والی آنکھیں بخوبی دیکھ سکتی ہیں کہ جلیس صاحب کی ذوبی ہوئی آنکھوں میں ایک دو نہیں ہزاروں کہانیاں کر دیں ہے رہی ہیں۔ ان کی خاموشی، ان کی گویاں، ان کا تھا طب، ان کے پیچے کا تلاطم سب کچھ کہی کہانی سے کم نہیں۔ اگرچہ ان کی افادہ ملکاں شخصیت پر ایک صحافی عادی ہو چکا تھا، پھر بھی یہ صداقت کہیں نہ کہیں سے رہ رہ کے ضرور جانک پڑتی تھی کہ ہم سب کے درمیان ایک ادیب برابر دل کی طرح دھوک رہا ہے۔ کمرہ باتوں کی پھلپھلیوں سے دک رہا تھا۔ ہم سب کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے، سُن رہے تھے، ہنس رہے تھے، مسکرا رہے تھے، شاد ماں تھے۔ تاہم ایک غوف ہم ہندوستانی ساہیوں کے چہروں پر ملے کی طرح علانیہ لرز رہا تھا۔ اس بات کا خوف کہ شادمانی کی یہ گمراہ مختصر ہیں۔ چند ہی روز بعد جلیس صاحب پھر بچھڑ جائیں گے اور مسکراتے مسکراتے میں نے یک لخت بڑی کڑا اپنے اور خاش محسوس کی۔ میں نے کہنا چاہا : جلیس صاحب! آخر آپ یہاں سے چلے گیوں گے۔ مانا کہ آپ کے حق میں حالات اس وقت نازک تھے، مگر جن صعوبتوں سے ایک فن کار اپنے ذہنی سفر میں زندگی بھر گزرتا ہے، کیا وہ علی سفر میں ان سے نہ گزد پاتا؟ — مگر میں نے کچھ نہ کہا اور اٹھ آئی۔ اپنے چھپے ہوئے خوف اور غلشن کے باوجود مجھے لگا کہ ایک روشی سی آس پاس جگہ کارہی ہے اور جب روشی پھیلتی ہے تو کھلے ہیداں کی طرح تاریک تہہ خالوں اور حابس زندالوں کو بھی جگھکائے بغیر نہیں رہتی۔ فاصلہ م Gunn وجود کا، دیس کا نہیں دل اور محسوسات کا ہوتا ہے۔ کوئی پرداہ نہیں اگر جلیس صاحب سر زمین ہند سے پھر میلوں ڈوچھے جائیں۔ اور پھر اونچی دیواریں دریان میں اٹھ جائیں۔ پچ تو یہ ہے کہ وہ ہمارے ذہنوں اور دلوں سے کبھی نہ جائیں گے کہ جو آدمی گزرے ہوئے نقوش اکٹا کرتا ہے، آنے والے واقعات کی تصور بناتا ہے، لگی ہوئی مٹوکر دل پر پھتا تا اور جتن سے حاصل کی ہوئی مسرتوں کا شمار کرتا ہے اس کا غم خود ایک فکر ایک طاقت بن جاتا ہے۔ اور میں مسکرا پڑی۔

جہاں ناگزیر سمجھی مگر ہم سب یقیناً پسرا کئے ہوں گے اور اپنی اگلی ملائکتوں سے زندگی کے حسن دناریگی

کے لئے پھر تردد نہ کر سکتا تو اُن کی آبیاری کر دیں گے لیکن، ۲۰ انور کی صبح کو یہ پُر جوش امید ہیشہ ہیشہ کے نئے دم توڑ گئی۔ جب ہیشہ بُجھا ہی بُجھا اخبار میں یہ اندوہ بننا کے خبر پڑی کہ ابراہیم جلیس اس دنیا بھی سے گزد گئے۔ اس خبر کو پڑھ کر میں تھوڑی دیر کے لئے اپنی جگہ با مکمل خاموشی اسی بیٹھی رہ گئی۔ میرے اندر ہندوستانی تہذیب اور پاکستانی صناعت کا ایک گوشہ ڈالوں ٹوٹی ہوا۔ ایشیائی ادب کی آنکھوں میں ایک آنسو لزا اور میں نے اپنی سوکھی سوکھی آنکھوں سے کہا، رو۔ تم بھی رو۔ ہر خر قسم مولیٰ کیوں نہیں ہو مگر اس وقت میری آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکلا۔ بُجھے یوں لگا، اسی گھڑی میرے اندر ایک شنقبھی سی قبرن گئی ہے جس پر اسی وقت نہ بھی شدتِ فم کی کمی کے بعد عمر بھری اور نہ اند تازہ چھوٹوں چڑھانے ہیں کہ اس الحمد میں اس شخص کی یاد خواہ بسید ہے جو صرف ہمارا محبوب فن کار ہی نہیں بلکہ اس نیت کا حاصل ہے اور بھی خواہ تھا جو نہ صرف جسمانی طور پر قد آور تھا بلکہ ادب اور صناعت میں بھی ہمیشہ بلند قامت رہا۔ جو مصلحتوں کے آنگے کبھی نہ جھکا بلکہ بُجھے بُجھے آفروں کو ہمیشہ خود اپنے آنگے جھکایا اور یوں اپنے کردار کی استقامت سے نام دکن کو ہمیشہ سراہ فراز دکھا۔ تب میں نے کچھ جھنجھلا کر سوچا۔ جلیس صاحب ہندوستان سے پاکستان پلے گئے ان کی مرضی محو رہا۔ آخر اخیں وہ نیا ہی سچے چلے جانے کی اتنی جلدی کیا تھی۔ مانا کہ جانا ضروری ہے مگر کچھ رُک کر بھی تو جاسکتے تھے۔ لیکن جیسا کہ آپ ہم بجانتے ہیں وہ بُجھے بُجھت پسند رہے۔ ہر کام فوراً اور ہمیشہ وقت دعیر سے پہلے سرانجام سے دیا۔ شاید (اللهم) عادت کے تحت اپنا آخری پر ڈرام بھی طے کریا۔ اور میں نے دکھ کو بھلاہٹ کو دبا کر سوچا شیک ہے۔ زرد چہرے۔ "ٹکونا دیں" چالیس کرور بھکاری، "چور بازار" دو ملک ایک کھانی۔ اجائے سے پہلے جیل کے دن جیل کی راتیں اور "دیوار چین" کا مخفف، "جنگ" کا کالم، "مداد" کا ایڈیٹر اب ہم میں نہیں کہ پیدائش اور موت دو اٹھی حقیقتیں ہیں۔ ان کا گزر جانا بلا سبب ایک بڑا المیہ ہے لیکن یہ حقیقت بھی اتنی ہی اُنل اور ناقابل فراموش کر جو زندگیاں بڑھیا مقاصد کے نئے جیتی اور جان دیتی ہیں وہ کبھی مریامت نہیں سکتیں، ایک ایسا دردبن جاتی ہیں جو زندگی کے سینے میں ہمیشہ جاگتا رہتا ہے اور زندگی کو دولت احساس سے مال رکھتا ہے۔

وہ ہمارا ایسا زخم ہیں جس کا اندر مال خود ہیں منظور نہیں۔

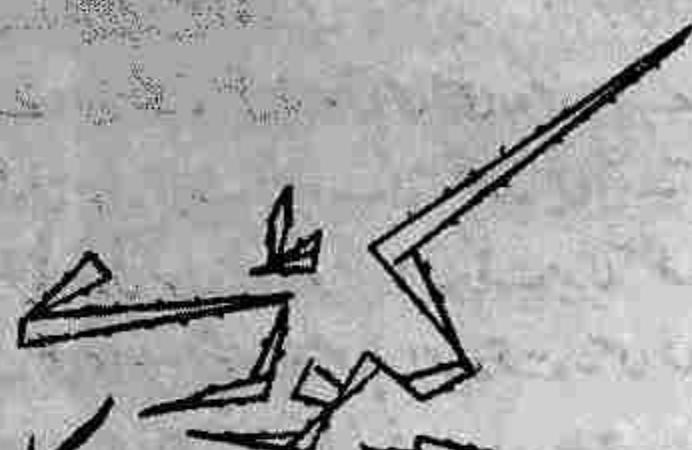
جلیس صاحب! آپ کہیں بھی چلے جائیے، ہم آپ کا پیچا نہ چھوڑیں گے۔ دیر سویر آپ کو آہی لیں گے اور تب آپ سے ضرور یہ پوچھیں گے کہ:

..... اب ہم سے بچ کر کہاں جائیے گا



ضیا راحمن موسوی

(پاکستان)



کا مُھول مرجھ کایا

(ابراهیم جلیس کی یاد ہیں)

"میں مر نہیں سکتا، گاہ مل جی! " تفہیم برصغیر کے بعد ابراہیم جلیس نے یہ صورت نکھا، اس مفترقہ میں ابراہیم جلیس نے "میں" اپنے لئے ہنسی بکھر کیں "میں" کا مطلب "ہندوستانی مسلمان تھا" جس کو اس کے متعصب اہل دین ختم کر دینا چاہتے تھے مگر ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو "میں" ابراہیم جلیس کی موت کی خبر سن کر بار بار یہ کہہ رہا ہوں تم مر نہیں سکتے۔ ابراہیم جلیس اور تم سے مراد فقط ابراہیم جلیس ہے جس نے اور دو ادب اور صحافت کے لئے اپنی زندگی رنج دی تھی۔ میں ابراہیم جلیس کو ۲۴ اکتوبر سے جانتا ہوں حیدر آباد دکن میں جب میں حکمہ اور مذہبی میں تھا اور انہن ترقی پر مصنفوں نے شاخ دکن کا کوئی تھا اس زمانے سے ہم دونوں "ہم جلیس" تھے۔ جلیس ابتداء سے زرد قلم تھا اور فطرہ اور بید سے زیادہ صحافی تھا۔ اس اور انہوں میں وہ کبھی دقت کا قائل نہ تھا۔ میں اکثر جلیس سے کہتا ہے:

نالہ ہے ببل شرسیہ ترا خام ابھی اپنے سینے میں ذرا اور اسے خام ابھی
مگر وہ کبھی نہ مانا گریا اس نے قسم کا رکھی تھی کہ اپنی تحریر پر کبھی نظر نہیں دکریا۔ چنانچہ میں مر نہیں سکتا! گاہ مل جی پر ترقی پسند ملقوں کے قاضی عبدالغفار گروپ نے نہ صرف اعتراضات کے بلکہ جہاں تک فتحے یاد ہے جلیس کو انہن کی رکنیت سے محروم کر دیا۔

ہنسا سکتا۔ نہیں کہا ہے پرہا بلیس یہ دے نیاز تھا جیسے انہیں نکال دیا ہے! میں نہ تائیغ اور بکھر کے حوالے ہے اس کا یہ میں جو باتیں انہیں کے جبے میں کبھی تھیں ان کو من کے بلیس نے کہا "آٹو یار، ایک سترن پسند محسنین کی انجمن بنائیں مسلمانی اس کا صد ہو، نظر جید رہا دی کو سکریٹری بنادیں اور تم مجلس عاملہ بن جاؤ۔" کیوڑے کا چول" بھرے اور جلیس کے درمیان ایک روز تھا جس سے فقط "نظر اسٹڈی خاں" واقع ہیں مگر آٹھ میں اس کو آشکار کر دیا ہوں۔

• آج ہمارے انسو اُس کی سچائی کو یاد کرو ہیں

لٹکتے کی ایک شام تھی، ایک اربی نشست سے انہوں کے میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ بجا رہ لے جا رہا تھا جہاں جلیس حسین رحاب صوبہ بیدار کے بیگل پر اور دہلیس کا اجتماع تھا جس میں خواجه حسن قندهاری مرحوم تعریر کرنے والے تھے، راستہ لبا تھا۔ دوستوں نے کہا ہر کوئی اپنا کہنا ایک ایسا موقعہ نہیں جس میں اس کی ادبی تحقیق پر کسی باذوق خاتون نے کوئی فاسقہ دانی کی ہو، اس سے پہلے جلیس نے گفتگو کا آغاز کیا اور کہا کہ ایک طبق میں نے دن کی روپیہ سے اپنا انسانہ نشری کی کچھ دینہ لفڑی الحسن اور نفل الرحمن صاحب سے گفتگو کی اور باہر آیا تو ایک سیاہ یمنی کھڑی تھی جس میں باریک ریشیں پر دے رہے تھے۔ دنایور جب دردی پہنچنے تھا۔ میرے قریب آیا اور پوچھ بیگم صاحبہ آپ کر کارڈی کے پاس بٹا رہی ہیں: میں قریب گیا تو نظری آواز میں خاتون نے میرے اذاؤں کی تعریف کی۔ ایک گورا ہاتھ کھڑکی سے نکلا اور مجھے پار کر کاہ عطا ہوا۔ پھر کہا گیا کہ ندا نزدیک آئیے اور اسی بات کے لئے ایک کیوڑے کا چول "سیر سوت" کے کار میں لگا دیا۔ اس وقت گھاڑی مغلام جاہی مارکیٹ کے قریب پہنچ گئی تھیں پیش کیا گیا "جھانگی گھانگی گھانگی" اور دکان کے سامنے رک دی۔ دکان اچھے پاؤں کے علاوہ اپنی رسائل ملنے کی جگہ بھی نہیں۔ سب لوگ اترے اور پان لکھانے دکان کے قریب گئے۔ دکان کے باہر سادے پان ایک بالٹی میں بھیج گئے رہتے تھے۔ اور بالٹی میں ایک دیرینہ فٹ کا کیوڑے کا چول پاؤں کو خوشدار بنت زئے لئے پڑا رہتا تھا۔ میں نے ہاتھ دال کر کیوڑے کا چول باہر نکالا اور کہا جلیس یہ ہے "کیوڑے کا چول"! تمام ساتھی ہنسنے لے جائے گئے۔ اور دو کافر اور پیشان تھا کہ جیسا کہ دیتا تھا کہ دوایسی شاستگی کو فراموش کر کے یہ مشرفاء اور ارباؤں کیوں دیرانگی کا شکار ہو گئے ہیں.... جلیس بڑی صعوبت سے مجھوٹ بدلتا تھا۔ ہمایت بے ضرر مجھوٹ جس کو اس کے احباب بخوبی بھیجنے تھے اور اکثر یہ جھوٹ اس کے افساز میں بڑی خوبصورتی سے کھپ جلتے تھے۔ کیوڑے کا لطیفہ ہم دونوں کے درمیان پاکستان میں ایک ہمیت تھا اور ہنس کے ہمیشہ بھی منع کر دیتا تھا کہ یہ رانہ فاش نہ کی جائے فقط ہمارے محترم "نظر اللہ خاں" حاج سے میلان اس کی حقیقت بیان کی تھی اور جلیس کو اکثر دھمکی دیتا تھا کہ ایک دن کسی معمون میں یہ تعلیم ضرور تکھوں گا۔ مجھے کیا سلام تھا کہ وہ دن اس کی فندگی میں نہیں آئے گا۔ ایک دن جب وہ بیماری دل، کامیاب ہو کر اسپتال میں داخل تھا میں عیاد کئے گی۔ جلیس نے حب عادت کرنے والے میمون کے قلعے بیان کرنا شروع کئے تو میں نے کہا اچھا تو آج میں۔ کیوڑے کے پھول کا راز فاش کئے دیتا ہوں اور پرسوں اخبار میں تم پر سمعون چھپ جائے گا۔ جلیس نے کہا ابھی ہنس، یہ

دل کی بیماری کو مجھے ختم کر دیگی اور پھر جب تم تعریف مصنفوں نکھنا تو اس میں یہ دا قبر نکھدیتا۔ میں نے کہا جیلیں یہ سب سے بڑا جھوٹ ہے، تم ہرگز نہیں مر دے گے بلکہ یہ سے بعد شاید تم جو مصنفوں نکھو گے اس میں خود اس داقعہ کو دکر کر دے گے۔ آج میسے اُنہوں کی سچائی کو یاد کر رہے ہیں اس کے جھوٹے سنتے بڑی حقیقتوں پر اپنے فتنہ ہو ستے تھے۔ اہل تکری کی زندگی جیسی ہوتی ہے اور جیسی ہونا چاہتی ہے، اس طبق کو پڑ کر ستے تھے۔ وہ ایک شوہر، ایک چاہنے والا بیٹا اور سماج کا ایک ذمہ دار رکن تھا۔ میں نے ایک مشہور انسانہ اور نادل نگار کی غیر شرعاً نہیں زندگی پر اس کی برا فروختگی دیکھی ہے میں نے ایک بہت بڑے ناشر کے نام اس کا بے باکا ذخیرہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جس میں اس بندی کی بھاٹا "پہ خدا آپ کو، اس سے لکھ رہا ہوں کہ آپ سے کم ہے ایک ان ناشر مجھے اور کوئی نہیں ہلا۔"

ایک ربعہ کا ذکر ہے کہ روزنامہ جنگ کی کام نگاری چھوٹ کے جلیس ایک اخبار کا ایڈیٹر ہو گیا جب یہ مسئلہ ختم ہو گیا تو جلیس نے میر خلیل الرحمن صاحب کو ایک خط لکھا کہ میں اب دوبارہ آپ کے اخبار میں کام کرنے کی خواہ نہیں کر سکتا ایسا نہیں میں افسر رائل کی ایک جگہ ہے۔ اس کملے اگر آپ سلسلہ جنبائی فرمائیں تو میرے روزگار کا بندوبست ہو سکتا ہے اور آپ کے اخلاص سے مجھے یقین ہے کہ آپ نہ رہا اس کام میں اپنی بھروسے۔ اتفاق سے اس دن میں جنگ کے دفتر گیا تو میر صاحب نے مجھے جلیس کا وہ خط دکھایا۔ میں نے کہا میر صاحب اور وہ صحافت کی بخششی یہ ہے کہ اس میں کام نگاری کی بڑی قلت ہے۔ جلیس کو آپ کی کوشش سے یہ بڑی نوری مل سکتی ہے مگر یہ ایک کام نگار کی منصب ہوگی اور یہ اُردو صحافت کے لئے ایک الیکٹریک ہو گا۔ میر صاحب میری بات سے بہت متاثر ہوئے اور مجھے بڑی خوشی ہوتی کہ نام واقع فضا کے باوجود انہوں نے پہلے سے زیادہ تباہ پر جلیس کو جنگ کا کام نگار بنادیا۔ میرا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ طفیل حمد جمالی مرحوم اور ابراہیم جلیس مرحوم دو زور اخبار کی ایڈیٹری کے لئے نامزد ہوتے تھے ان کا صحیح منصب کام نگاری تھا۔ ہر ادیب کے لئے اخبار میں مقالہ نگاری یا کام نگاری کے ملادہ کوئی اور جگہ نہیں ہوتی۔ اوارتی ذمہ داریاں انتظامی صلاحیتوں کی عجیب طلبگار ہوتی ہیں۔ یہ مردی کی بھی جو ہر ادیب کے لئے ایک خارجہ ہے۔ روزنامہ تو کچھ جھاتی اور جلیس نے چفت روزہ اخبار نکالے اور غیر تعلیقی مصروفیات میں کتنا وقت صاف کیا۔

ابراهیم جلیس وہ بھی تھا جو اپنی پیز نگاری اور مخلوقی طبیعت کی وجہ سے سہی شہ صحافت کے انجاروں سے اپنی انگاریں بدلاتا ہے حالانکہ اس کی اصل جگہ دنیا کے ادب تھی جہاں اگر وہ ریاض کرتا اور روشنے کے بجائے سنجھ سنجھ کے قدم رکھا تو اس میں کا بڑا معتبر ادیب ہوتا۔ اور کرشن چند کی طرح پاڈ ارشٹر کا مالک ہوتا مگر وہ خمامہ احمد عباس کی طرح کبھی صحافت کو طرف گیا کبھی نلم کا دنیا کی طرف اور کبھی افزاد نگاری میں خطابت اور صحافت کی کاک شیل بنانے کی سعی کی۔ جلیس ذہنی تھا اور اور طے سے زیادہ ذہانت کا مالک تھا اس کے قلم میں بھیاں بھری ہوتی تھیں وہ خود سماں طبیعت کا مالک تھا۔ وہ معاشرے کی بیوی قرار دیا اور اضطراب کا نمونہ تھا، اس نے بہت لکھا، وہ بہت پڑھا گیا۔ وہ ایک حساس طبیعت رکھا تھا وہ اس آگ میں جلتا رہا مگر ہمیشہ تھیک ہے لکھا رہا۔ وہ ناؤش پسند تھا۔ اس کی ناؤش میں بین الاقوای میلوں سے زیادہ ہجوم رہا۔ مگر وہ آج قدمی کی کم نظری کا رنگ لئے گو شد الحمد میں جاتے ہوئے ہم سے کہہ گیا ہے

کم نظر عیاںی جانم نہ دیں اُنکام رید رینہاں نہ دیں (اقبال)

اس صدی کی صحت اور صحافتی ترقی نے کئے۔ ادبی رسائل کی مادگی اور پرکاراً تھیں ان کے لئے اور ہم اپنے نام کے متعلقین بینک بیلنس اور ریگیسٹری دوی طلب نہیں کرتے تھے۔ آج کے مقام پر کچھ اور ہیں آج کی نسل کا ہیرود "اقبال" نہیں "سکس ملین ڈالر میں" ہے۔ ابراہیم جلیس کی یاد مناتے ہوئے اس کو ماں کے اقدار سے جانچا اور اس میں علاالت سے سمجھوتہ نہ کرنے کی خصوصیات تلاش کرنا نہ صرف اس کے ساتھ زیادتی ہے بلکہ اپنی حالت سے بھی غلط ہے۔ روز نامہ کی عمر ایک شب دو روز ہے ماہناموں کی ایک ماہ ہے۔ یہ سلسلہ روز و شب ہے جس سے ذات اپنی قبائے صفات پر بناتی ہے۔ بعد برہن وقت اور خاصہ کی طنز بین کشی رہ جاتی ہے۔ اس بدلتی ہر قسم دنیا میں ابراہیم جلیس نے تیز رد قافلہ جو جس درستک اپنی بات سننے پر مجرور کر دیا وہ اس کی کامیابی ہے۔ وہ ان معنوں میں بھما بڑا آدمی ہے کہ آج کے زمانے کے ہوں یا آئے دلے کل کے، وہ اس کے قلم کی گردش کو یاد کریں گے اور یاد ہی تو نہ نہیں ہے۔ ۰۵

قطعہ تاریخ رحلت ابراہیم جلیس

پاک طینت نقیس ہے اُردو
ہر زبان سے سلیس ہے اُردو
آہ سوز وصال ابراہیم
باغ فدائیے جلیس ہے اُردو

۱۹۷۷ء

ستارچشتی
(حیدر آباد)

"ابراہیم جلیس میں نظرافت اور غوفی کوٹ کر جھری تھی۔ اس صلاحیت کو انہوں نے اپنی تحریریوں میں بھی استعمال کیا اور خوب کیا۔ جب وہ انجارہ جنگ سے داہم ہوئے اور مزاہیہ وطنزیہ کا لام دغیرہ دغیرہ" لکھنا شروع کیا تو طنزہ مزاج کے پرداز نشر چلا کہ — ان کی تحریریں ادب کا ایک حصہ بن گئیں۔ فکاہیہ نگاری میں انھیں بڑا ملکہ تھا۔ پھونے پھونے دعوات کو خوش اسلوب سے بیان کرتے تھے اور سماجی معاشرتی اور معاشی موضوعات پر ان کی اگری نظر تھی۔ قارئیوں کو حیرت ہوئی تھی کہ اُردو ادب کا ایک ترقی پذیر افسانہ نگار جو انتہائی پیغمبر و مرمندیات سے افسانے لکھا رہا ہے کس طرح طنزہ مزاج کے میلان کا شہزادہ بن گیا ہے۔ یہ طرہ امتیاز مرفت انھیں ہی عالمی تھا کہ وہ بیک وقت اپنے نگار بھاگتے طنزہ مزاج کے کالم فریں بھی اور صحافتی بھاگتے۔ "میر حامد علی" کراچی۔

نصر اللہ خاں
(پاکستان)

بائے حلمس

جلیس کی ناگہانی سوتے جو چاہتا ہے کہ دیوانہ فارہنسوں اور قبیلے لگاؤں۔ یہی ہنس اور تھیقہ دہ جو اندر ہیں دے کر گیا ہے اور یہ اس کی امانت ہیں اور اب اپنی مسکراہتوں کے پھولوں کی پادریے کر آج میں اس کی تربیت پر جاؤں گا۔ اور ان سدا بہار پھولوں میں اپنے آنسوؤں کے موئی پر وہ کہ اس کی قبر پر چڑھاؤں گا۔

رہنمائی۔ اپنے گھر میں پھول برساتے اور

تم بھجو سے ترقیت کر سکتے ہو۔ لیکن اپنے دکھو چھپا کر سارے معاشر کی تکالیف تھے۔ جب میلکے اخبار میں اپنے عہد کو تم پر غارج کا حملہ ہو گیا ہے تو میں نے سوچا کہ تم نے مذاق کیا ہو گا اور پھر جب مجھ پر شنا

وہ بھی ان حالات میں کہ میک رہی گے

تمہاری محنت کی بہار تو اب آئی تھی۔

یہاں رلانے والے بہت ہیں۔ ہنسنے والے

کب کے رخصت ہوئے۔

وہاں خواجہ معین الدین ہیں طفیل احمد

جمالی ہیں، مجید لاہوری ہیں، شوکت تھانوی

ہیں، حضرت اور سالک ہیں انہوں نے

کس گرم جوشی سے تمہارا استقبال کیا ہو گا۔

لیکن یہ موجود کہ تمہارا کام بدلائی میں ہمارے

اور شہریار تمہیں اس بربادی سے نرک

جلیس مجھے تو اب بھی مذاق معلوم ہوتا

سکا۔ شاہین کی دماغی حالت کو تم نے

کس حوصلے سے بدداشت کیا۔ تم اُسے نہ کیا

ہے ابلاکٹی سوچ بھی سکتے کہ تم

گز دے گی۔ اب بات سے بات کون پیدا

کرنے والے ہوں میں غلو سے کام یا کرتے

اپنے بیوی کا پھول سے قریب مذاق نہ کرو۔

یہاں رلانے والے بہت ہیں۔ ہنسنے والے

کے پھول دیکھتے زبیدہ کو کس محنت اور محبت

سے تم نے دُاکر رسانا یا تھا اور نبیدہ بھی

ایپنی محنت سے تمہیں نہ بجا سکی۔

شہریار کی طرف دیکھو اس کا لگر آباد

کرتے رہی تم اپنا غاندالی برباد کر گے۔

ہو گئے ہو تو یوں لگا جیسے بھجو پر فارج کا حملہ

ہو گیا ہے۔

جسیں مجھے تو اب بھی مذاق معلوم ہوتا

سکا۔ کسی کی دماغی حالت کو تم نے

جو تھوڑے سے دن رہ گئے ہیں تو ہم پر کیا

ہے ابلاکٹی سوچ بھی سکتے کہ تم

گز دے گی۔ اب بات سے بات کون پیدا

کرے گا۔ اب تربات سمجھنے والوں کی تعداد
بھی کم سے کم ہوتی جا رہی ہے۔
پرسوں اجدب میں نہ تھیں بلیغون کی تو پہلی
رخصی یہ دیکھا کہ تربت آنندہ ہونے یہ
امد آج ہم نے معافت کی قربانی
پر ایک ہفتہ ہنسا آور چکت ہوا
جو ان سال ادیب اور کالم نریس
چڑھا دیا۔

میرے بلیس کو جوان سال یوں کہا ہے
کہ اس کا مزاج مدا بہار تھا۔ وہ انتہائی
بھولابھالا انسان تھا۔ وہ دوستوا نہ
دوست تھا اور دشمنی تو وہ صرف اپنے
ہی ساقو کرنے کا اہل تھا لیکن آخری
وقت میں وہ ہما سے اور آپ کے
ساتھ دشمنی کر گیا۔ اللہ تعالیٰ اس کی
ترہست پر اپنی رحمتوں کا بے پایاں
نزول فرمائے اور ہم سب کہ اس کی
جدائی برداشت کرنے کا حوصلہ اور
ہمت دئے۔ (آئین)

میرا جی پاہنچ کے تھا قبر کو مجنوب کر
تم سے ایسے کتنے ہی سوال پوچھوں جو میرے
دل میں کائنے کی طرح چھو رہے ہیں۔
امد آج ہم نے معافت کی قربانی
پر ایک ہفتہ ہنسا آور چکت ہوا
جو آپ کا احمد علی غاصب صاحب سے ہے
امد پر میں اکلب کا ہاں تھوہر سے گئی اسٹا
جب بھی تھوہر جو جستہ کہا کہ وہی رشتہ
کرتے ہیں اور پھر تم نے ڈیلیغون پر ہنسا
ہنسانا شروع کر دیا۔

اب جب میں تھا، میں بہنا نے والہ باتیں
یاد کرتا ہوں تو میری آنکھوں میں آنسو آب دتے
ہیں اور میرے قہقہے جھینیں بن کر میرے بینے
سے نکلتے ہیں۔

جس دن سے تم نے مزاحیہ کام لکھنا آپ کو
تھا میرے اسی دن یہ سوچ لیا تھا کہ تم
زیادہ دن ہما سے درمیان نہیں۔ ہرگے
اور تم خود جیتے یا نہ جیتے یہ تمہارا اپنا فیصلہ
تھا لیکن خدا کے لئے یہ تو بتاؤ کر جو
روگوں کو تم انتہائی مشکوم حالات میں نکر لیتیں
سکھ دیا جائے جس پر اس اخبار کا دفتر ہے
اوپر تم نے یہ کہا کہ اس سے یہ ہو جاؤ کر اخبار
زچلا تو نہ سبھی سڑک ہی ملپتی سے ہے گی۔
کیا بگاٹا تھا کہ اس قدر دشمن ارباب
وفا کیوں ہو گئے۔

ایک مرتبہ میرے تھے پوچھا کہ تمہارے
اخبار کی ریڈیشپ کتنی ہے تو تھے بوجستہ ہی

خیر تم تو پڑھ لے گئے۔ لیکن یقین ما فر کہ

(کالم "آداب عرض" سے)

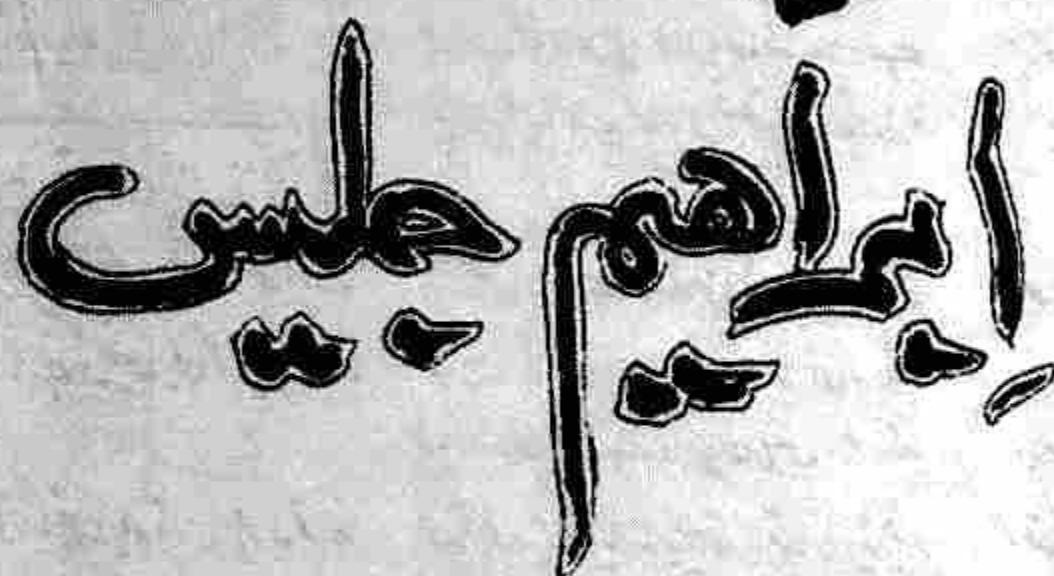
۱۸۰ شاعروں کی شمولیت ۱۹۷۶ کی ملخچ بغلہ

انتخاب : مناظر عاشق ہرگز نوی، فرمود قادری

قیمت ۱ صرف پانچ روپے مائیں دیا گئی ناشر، عصر پبلیکیشنز کریم گنج، گلگت (بخار)

سلطانہ مہر
(پاکستان)

بُت شکن



آس بُت شکن سے میری پہلی ملاقات بھی عجیب تھی۔ ابراهیم جلیس کا نام ہی نہ مٹتا تھا۔ ان کے خوبصورت افسانے جو پڑھنے تھے اور چالیس کروڑ بھکاری کے نبات دیندے کو دیکھنے کی آہزوں بھی اعد جیب طاقت ہوئی تو وہ ایڈیٹر کی قبایہ تھے میرے سامنے کھڑے تھے۔ ایک شخص کے تین روز اس وقت میرے سامنے تھے۔ ایک ابراهیم جلیس سے بُت شکن کا انصراف دا بستہ ہے۔ ایک بلند قد دقا مت کا افسانہ نگار اور ایک صحافی جو کامیاب کالم نویس تھا اور جس نے روزنامہ "جنگ" کے صفحات پر اپنے کالم دفترہ وغیرہ سے ملپٹے تکمیل کی تیر کی منوالیا تھا اور جس کے کامیاب ایڈیٹر ہونے کی توقعات بھی ہم ہم سب نے دا بستہ کر لی تھیں۔ لیکن پھر کچھ ایسا ہوا کہ روزنامہ انجام جو پریس ٹریٹ کا اخبار تھا اس کی کرسی ادارت تھیں راس نہ آئی۔ ایک زبردست ہرگز ہوتی کارکن رفتہ انجام کے سامنے واقع آدم جی بادس کے فٹ پاکھو پر جائیتھے اور جب ہرگز ہرگز ختم ہوئی تو ابراهیم جلیس وہاں رہے نہ ہم۔

میں اور وہ پھر روزنامہ جنگ کے ادارے میں بھاہوئے وہ پھر کالم نویس کی کرسی پر جائیتھے تھے اور یوں مجھے انھیں پہلے سے زیادہ ترمیب سے دیکھنے کا موقع لا

تو معلوم ہوا کہ یہ شخص ایک آہنی مدد نامست۔ رکھتے ہوئے انہی سے بالکل پچھلا ہوا ہوم ہے مردست کا اس کے اندر تپش ایسی کر اس کا اٹھنا بھیسا بولنا پاالناسب بکھر ایک پونا صفر عرصہ سوم ووکر ۷۵

انیس فیض نہ لگ جائے آبگینوں کو

وہ آئندہ داں تھے اور میں اہل بے زبان یکن وہ جب بھروسے گفتگو کرتے تو اپنی زبان دانی کے بت گاڑتے نظر کتے اور میں اُن بیوں کو تردد نہ کسی پیغمبیر میں معرفت رہتا۔ بھر ایک دن انہوں نے اپنے بکھر سے کہا۔

”ارے بھٹی وہ کوئی افانہ ہے مجھے بھی قریب ہوا یہ یہ نہ بڑی شہرت تھی ہے اس کی“

دوسرے دن میں نے اپنا افانہ ”آدمی روٹی“ کا مسودہ انھیں سے۔ پڑھو کر انہوں نے ایک پرچہ پرستقبل میں میرے بہترین افسانہ نکار بنتے کی پیش کوئی کھو کر دی اور بولے اسے سنبھال کر رکھتے تھے اور اگر میری بات غلط ہو تو بت شکن نہ کہتے گا۔ پھر میں صرف جیسیں رہ جاؤں گا۔

”لیکن اب تک تو آپ بت گاڑتے آئے ہیں اور اب ...“

”سلطنت پڑھی بھی آپ کا افانہ پڑھو کر اصلاح کرنی۔“

یہ ۱۹۶۰ کی بات تھی۔ اب ۱۹۷۰ ہے، یہ پرے دس سال گزر چکے ہیں۔ میں آج بھی اسی کمرے میں بھٹی ہوں ہیں میں دس سال قبل بھٹی تھی میرے کمرے کے بالکل سالم نہ بت شکن کا کمرہ تھا ہم دونوں جب کبھی اپنے اپنے کمرے سے باہر آتے تو اکثر آنسا سماں ہو جاتا ہم دونوں کے قدم اپنی بگھر دک جاتے وہ مسکرا کر نہیں بلکہ قبقبہ لکھ کر اسلام علیکم کہتے ہیں جواب میں صرف مسکرا کر آداب کہتی اور سوچتی۔

میری نافی اہم نے ایک بار کہا تھا کہ ہنسنے مرد اور روئی ہو تو میں کبھی کامیاب نہیں گذا سکتے۔

تو یہ جلیس صاحب ہر دست ہنسنے کیوں رہتے ہیں؟ لیکن اب مجھے اس بت شکن کے ہر دست ہنسنے پڑھ بخوبی میں آگیا ترمیم نے لپٹنے کرہ کا دروازہ کھول دیا۔ سالم بھی ابراہیم جلیس کا کمرہ ہے لیکن اب ابراہیم جلیس وہاں نہیں۔ دہان ایک مشین رکھی جوئی تھے ایک مشین امداد ہے دوسری مشین آنکھی۔ بت شکن بھی اس کمرے کی کرسی چھوڑنے کے بعد مشین بن گیا تھا اور پھر حالات کے تعمیروں کی ادائیت کھاتے تھے مشین کا ایک پرزوہ بن کر رہ گیا۔ دہنہ ہر دست ہنسنے دہا۔ اس طرح اچانک مشین کے ایک پرزوے کی طرح فاموش نہ ہو جاتا۔

وہ خاموش کب ہونا پایا تھا۔ اب سے ایک ماہ پہلے ہی ٹیلیوژن کے ایک پر ڈرام میں ہم اکٹھے ہوئے میرے دل میں اپنے ایڈٹر کے لئے وہی احترام اب بھی تھی لیکن اس میں ساتھی افاد نکار کی محبت اور غلام بھی شامل تھا، وہ بھروسے بہت یعنی تھے تجویں شہانے اسکا دقت دن سے شکوہ کیا کہ اب اپنے کیوں نہیں لکھتے۔ داکٹر ابوالغفار کشفی نے بھی یہی شکرہ کیا۔ اس وقت چالیس کروڑ بھکاری کے رہنمائے ہم سے بختہ دعوہ کیا کہ اب وہ جلد ہی ایک خوبصورت کہانی تخلیق کر سکے گا۔ ایک ماہ بعد ... ان کے دامنی سکوت سے پہلے میں نے فون کر کے انھیں اپنا وعدہ یاد دلایا۔

”اب تو کچھ فرصت ملی ہوگی نا...“۔ وہ حسب عادت قبقبہ لکھ کر بولے ”اب تو مرنے کی بھی ذمت

نہیں۔ دیڑھ سو سال تھی کارکنوں کی بیرون گاری کا ہول میرے مل و دراغ پر مسلط ہے تندیٹے میں کیا بخوبی ہے جیسے صاحب ہمارے ادیبوں کو ایڈیٹری اور سیاست رکس نہیں آتی۔ کم از کم ہمارے ٹک میں تجیل الدین عالی صاحب کے لئے میں خوش ہوں کہ ایک جھٹکے میں سنبھل گئے۔

"لیکن میں شاید اب نہ سنبھل سکوں۔ مسلطانہ صاحبہ میں آپ کو بتاؤں اس وقت میرے ذہنا کی طبا میں کھینچی ہوئی ہیں میں نہیں چاہتا۔ واقعی میں نہیں ہا۔ لیکن بات کچھ ایسی ہے کہ اب تو زندگی کی ڈور ہی کاٹ دینے کو جیا چاہتا ہے۔" اور پھر دی تھقہ۔

"لیکن جلیس مذاب وہ بات کیا ہے آخر؟" بات یہ ہے کہ بحسب پر روزگار کے حصول کے دروازے بن کر دیتے گئے ہیں میں آج بہت مالوں ہوں۔ بن رکھنے صاحبہ اب آگے کہنے کو کچھ بھی نہیں نہ ہی کچھ لکھنے کو جیا چاہتا ہے۔ لیکن پھر عجی اندماں ہے۔ آپ تو جانتی ہیں کہ میں کبھی جدوجہد سے نہیں ہا رہا۔ باں اس وقت جدوجہد سے مارا جاؤں تو۔۔۔ پھر دی تھقہ۔ اور اسی تھقہ کے درمیان وہ لوٹے "میں کہاں منکوارہ ہا ہوں..... آپ بھی تشریف لا میں۔ اس پیٹ سے تو چکارا نہیں ہے نا۔۔۔ اور پھر تھقہ۔۔۔

محیب مہسوسہ شخصیت ہے۔ "میں نے فدا حافظ کہکھ فون بند کر دیا۔ شاید غیر شوری طور پر اس تھقہ سے بچنے کے لئے جو ابر ایم جلیس کی شخصیت کا خاصاً تھی لیکن یہ تھقہ کس پر تھا؟ آج بھی میرے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ سامنے والے کمرے میں ابر ایم جلیس کے سی پرستی ہیں یوں جیسے ابھی ایک بُت ڈھائٹی گے اور پھر تھقہ لگائیں گے۔ لیکن یہ آوانہ مضم کیوں پڑتی جا رہی ہے۔ یہ تھقہ فضاؤ میں کم کیوں ہمہ ہا ہے۔ میری آنسوؤں سے دھنڈ لائی ہوئی آنکھوں کے سامنے تھقہ لگانے والا وہ چہرہ بھی دھنڈ لانا جا رہا ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میرے فون کرنے کے بعد کھانے کی پلیٹیں یوں ہی رکھی رہ جائیں گی اورہ اپنے ساتھیوں کے روزگار کے بھاؤ کے لئے جدوجہد کرنے والا بُت تکن خود ہی دیت کے ایک بھر بھر سے بت کی طرح ڈھنے کر رہ جائے گا تو میں اللدمیاں سے اتنی طاقت مانگ لیتی کہ وقت کا پہہ کچو دیکھو۔ دو اورہ اس بت تکن سے کہہ دوں کہ ابھی حوصلہ ہارنے کا وقت نہیں اپنے ساتھیوں کی باہوں میں باہیں ڈال کر اندھے چکو۔ ہمیں تو ابھی ایک نئی دنیا تلاش کرنا ہے اس دھری پر ایک نئی دنیا کی تعمیر کرتا ہے جہاں فکاروں پر تعزیر یاد ہوں جہاں زندگی کے پیروں میں زخمیں نہ ہوں جہاں بھول کھلنے سے پہلے مر جاتے نہ ہوں اور جہاں معنوی تھقہ لگا کر زندہ رہنے کا جو دنیا نہ ہو۔ لیکن وہ جواب سدا کس لئے خاموش ہو گیا ہے جس کے تھقوں پر موت نے اپنا آہنی بخوبی کھایا ہے۔ وہ جس کے آخری تھقہ سے میں جسم بھدار بھی تھی جانے وہ اس وقت کس کیفیت میں تھا کہ اگر مجھے مجھے عجز کریے احساس ہو جانا کہ یہ یکھنی آزاد منشوں کے لئے بھی بانداز ہے تو میں ایک آندہ کرتی وہ آرزو جواب ایک سوال بن گئی ہے اس سوال کا جواب بھی تو کوئی دے سکے۔

ہم ہر دوسری میں آجائے ہیں بدے ہوئے بھروسہ نیا ہمیں نے اک دن نفس اجھا سے غاروں کی دیواری پر ہمیں نے نہ ہر کا پیالہ پر کر پاؤں رکھا انکاروں پر کیا یہ نوازش کرے جہاں پر شاعر اور ادیبوں کی اس وحشی دنیا میں ہم نے نیو رکھی تہذیبوں کی پھر یہ بتاؤ میں سے یوں کم ہے مول ستابوں کا پانی سے بھل سسرا کیوں ہے آج ہو فکاروں کا

ابراہم جلیس

پچھیا دیں، پچھے تقدیریں

وحدت اختر

پولیس ایکشن سپہلہ کا حیدر آباد — رضا کار تحریک کا عروج، آزادی ہند کے بعد حیدر آباد میں علی گی پسندی در اپنی سالیت کو برقرار رکھنے کا سیاسی میلان — بڑی ہماہی، افراتفری کا زمانہ تھا۔ اونگ آباد جو ریاست کا دوسرا بہے بڑا شہر تھا۔ سرحد سے قریب، صدیوں سے نیم غنوہ، مغلی، مراثوں اور نظام کے زمانوں کی باقیات العالیات کریں سے لگاتے، سکون کا گھوارہ، جی جائی تہذیب اور کسی کائن معاشرتی زندگی کی خبری ہوئی جیں۔ وقت کی موجیں جیل پر سے یوں گز رعنی کو لہروں کے نتوش بھی نہ اجھرنے پاتے۔ تحریکِ ترکِ موالات اور خلافت کے کچھ ہارے ہوئے پاہی اپنے ساتھ شماں ہند کی سیاسی گرم چھاؤں کے جھونکے بھی لائے۔ مگر اس کا اثر صرف سطح تک رہا۔ اندر دنی طرد پر ایک طرف تو کانگریس کی مقامی شاخصیں قوم پرستی اور حیدر آباد کے ہندوستان سے الحاق کی تحریک چلا رہی تھیں، دوسری طرف برسوں سے منوع کیونٹ پارٹی جاگیر دار اور نظام کے خلاف نبرد آزماتھی۔ عام لوگ ان تحریکوں سے دور، روزمرہ زندگی کے محوالات میں بول گم تھے جیسے ریاست کو تبدیلی کی کوئی ہوا کبھی چھوپی نہ سکے گی۔ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اچاک برسوں سے زمین کے اندر پہنچ دتاب کھاتا ہوا لادا اُبی پڑا ہو۔ بظاہر سکون بستے ماحل سیاسی نعروں، نیم ذہجی تنظیم کے دہشت آفریں مگر، پھر کے دلوں کو گرا دینے والے حالات کے دھماکوں سے ٹوٹنے اور بکھرنے لگا۔ قاسم رضوی کی تیادت میں جداگانہ آزادی ریاست کی تحریک اور اس کے جواب میں کانگریس، آریہ سماج اور کیونٹ تحریکیں — ان میں مکار اپنے صدیوں کی غنیمت کو جنبہ رکھ رکھ دیا۔ دوسری جنگ عظیم نے دیلان خاںوں، ہٹلروں اور معزز میں کی ملاقات گماہوں کو جگ کی خبروں سے تو پہنچے ہی، آشنا کر دیا تھا، دبے دبے لفظوں میں تحریک آزادی کا بھی تذکرہ ہو جاتا تھا۔ لیکن ہر چیز

کے بعد تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے سیاست کے علاوہ کوئی موضوع گفتگوی نہیں رہا۔ ہندوستان کی آزادی میں کامیابی کا کوئی
جے عوام ریاست زدہ نظام پرست اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ مسلم لیگ جو درود قومی انظاریہ کی بخشید پر تمامِ پاکستان کے
مطلوبے کا علم بلند کئے ہونے تھے اور پھر اتحادِ المسلمين میں ہمارے یار جنگ کی صلیٰ قیادت کے بعد انہیا پسند قاتم، منور اور
اعتدال پسند گروہ کے رہنا ابوالحسن سید علی کی کش کش اور بالآخر تنا فی الذکر کی گوشتہ گیری۔ یہی سب باتیں ہر جگہ سنائی
دیتیں۔ پھر ایک دور وہ آیا کہ اسکوں میں اساتذہ اور طلباءِ جہاد کے دلوے اور جنگی نقشوں اور چاول کا ذکر یوں کرنے
لگے جیسے یہ نصیبِ تعلیم کا سب سے اہم جزو ہے۔ اتحادِ مسلم طلباء، اتحادِ المسلمين کے ذیماڑ علیحدگی کی علیحدگی۔ دکن ریڈیو
جنگی نعروں سے گونج رہا تھا۔ حیدر آباد سے آنے والے اخبارات و رسائل ادبی سطح پر بھی سیاسی علیحدگی پسندی کے حلیف تھے
اس عام میلان کے خلاف تحریکیں، تحریریں اور رسائل بہت دبے ہوئے تھے۔ اس پر رے تناقی کے دھماکوں، حوال میں جو
علم دلوں کی دھڑکتوں پر چل رہا تھا، تیز، طار، طنز ناک وہ ابراہیم جلیس کا قلم تھا۔ شعر بہت تھے مگر کسی کے قلم میں یہ
زور نہ تھا۔ مخدوم روپوشنی میں شاعری سے کنارہ کش مسلک کیونٹ جدوجہد چاربے تھے۔ بیکش، شاہدِ صدقی، نظرِ جناباں
اور کتنے بیاث عرقی سیاست کے آلات کا رکھتے۔ میلان اریب اور کچھ تھے شاعر و ادیب ترقی پسندی کے ذیماڑ جیلوں کی
زندگی سے آشنا ہو رہے تھے۔ وجہ منصف مجریت تھے سیاست سے الگ تھلک۔ نشانگاروں اور صحافیوں کی
اکثریت رضاکاروں کے اثر میں تھی۔ قاضی عبد الغفار، اختر حسن، عالم خوند میری، احسن علی مرتضیٰ عابد علی خاں، مجتبی بن جنگ
مسلم ضیائی، زینت ساجده، حسینی شاہد۔ کچھ سچھہ مشق، کچھ ذوش قوم پرستی اور ترقی پسندی کی شسموں کی حفاظت میں
لگے تھے۔ مگر علیحدگی پسندی اور ریاست کی آزادی کا طوفان اتنا شدید تھا کہ دامن جلسے جا رہے تھے۔ یہ دلچسپی
بے کہ اس وقت بہت سے ترقی پسندِ محی قوم پرستی کے عالمِ دھارے سے کچھ کٹا ہوئے تھے۔ کچھ ایسے تھے جو ادب کی
قوی سطح پر ترقی پسندی کے حلیف سمجھے جاتے تھے۔ مگر ریاست میں حکومت و رضاکاری کے ساتھ تھے۔ ان میں سب سے نایاب
اس وقت ابراہیم جلیس تھے جو علی گڑھ سے تازہ تازہ گریجویٹ ہو کر آئے تھے۔ اور حمالک محمد رضا سرکار عالی کی بیانی
و ادبی فضاء پر چاہے گئے تھے۔ ابراہیم جلیس سے ادبی سطح پر اخبارات، رسائل اور ان کی کتابوں کے ذریعہ میرا
تعارف اسی زمانے میں ہوا۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں اسکوں کا طالب علم تھا۔ ادب کو پڑھا اور سمجھنا سیکھ رہا تھا، لیکن
لکھنے کا شوق بھی تھا۔ اس شوق کے اظہار کے لئے نوجوان اور سلاموں کے علاوہ کہانیاں، بچوں کے (تلی) رسائلے معافیں
(متقابلے کے)، ریڈیو پر ڈراموں میں صداکاری، خود اپنی نظریں چھوٹے چھوٹے فیچر اور تقاریر کا فشرہ کرنا، اتنے بہت سے میداں
 موجود تھے۔ دکن ریڈیو اس وقت آزادی، ثلتِ اسلامی کی الفراہیت، اور مطلق العنان شاہی کی بھاری سے متضاد میلانات
کا ترجمان تھا۔ ریڈیو ہی کیا، اخبارات و رسائل کے ذہن بھی گڑھ تھے۔ معروف دباش عدو ادیب و شاعر یا تو ایک وقت
قوم پرست و شاہ پرست ہونتے تھے یا ایک ہی سانس میں ترقی پسند اور ریاست کی آزادی کے نقیب۔ اس تفاصیل کو
جذبائی سطح پر کسی طرح لوگ تحلیل کر لیا کرتے تھے۔ حیدر آبادی کیا، میں تو سمجھتا ہوں کہ ہماری پوری تحریک آزادی

کے رہنماوں میں بجز استثنائے چند کسی کا ذہن صاف نہ تھا۔ خلافت اور آزادی، رام راجیہ اور سوراچیہ، مذہب اور سیاست، اسلامیت اور سامراج دشمنی، ہندو احیا ایت اور انقلابی تصورات بہی ایک دوسرے سے خلط ملتے تھے۔ اس میں صحت عالی کے اثرات اب تک ہمارے معاشرے اور سیاست میں باقی ہیں۔ حیدر آباد کے صدماں دی کوئی وقت تین بتوں کی پرسش کا حق ادا کرنا تھا۔ ریاستی و فاماڑی، قوم پرستی اور مذہب — ان بتوں کی خوشخبری کی کوششوں میں اکثر چوتھا بے ثابت انسان دستی میں دیکھا رہ جاتا تھا۔ ابراہیم جلیس کے یہاں تک کہ آزادی کا بے پناہ عذہ ہتا، مگر وہ ریاست کے آزادانہ وجود کے تحفظ کے بھی علیحدہ دار تھے۔ مذہب کا اثر تو ان پر گہرا نہیں رہا لیکن انسان دستی کے دو تصورات ان کے یہاں غالب تھے جو سماجی، امنی اور سیاسی سطح پر انقلابی مضمونات کے عامل تھے۔ میں اپنے بچپن کے ناپختہ شور اور شوق میں شدید مذہبیت، جاگیردار دشمنی، ریاست دستی، شاہ دشمنی، ازدی دستی، سامراجی لفترت اور مارکسزم اپنے مختلف میلانات کی آمیزش اور آمیزش میں جتنا تھا۔ عمر ۱۲، ۱۳ سال کے درمیان ہوگی۔ ایک طرف حدیث، تفسیر، فتنہ، اسلامی تاریخ کے مطالعہ اور ایک قسم کی مولیت کا شوق، دوسری طرف ادبیت اور انقلابیت کا دلوں۔ نشنگاروں میں باوجود اپنے مذہبی تفتش کے میں نے سب سے زیادہ اثر نیاز فتحوری سے قبول کیا حالانکہ مجس کے نبرے جو کچھ کہتا اور پڑھتا تھا وہ اکثر اذعانتیت کی حد سے جاہل تھا۔ کہانی کا دل میں قائمی عبد الغفار، پرمیں چند، کرشن چند، منٹو، مصمت چنان، خواجہ احمد عباس اور نہ جانے کن کن کو پڑھا تھا۔ لیکن طرز تحریر سے دو سے خاص طور پر متاثر تھا۔ ایک کرشن چند تھے اور دوسرے ابراہیم جلیس۔ کرشن چند کی رومنیت و شعریت کے پردے میں طرز و نشریت بھی ہوتی تھی۔ دل کو سحود کر لینے والا اسلوب — ابراہیم جلیس کے یہاں کرشن کی رومنیت و شعریت نہیں تھی مگر کرشن چند کے طرزی اسلوب کی کاث اور زیادہ گہری ہو گئی تھی — چھران کے یہاں جو جذبائیت (SENTIMENTALISM) تھی وہ بھی ناپختہ ذہنوں کو اپنی کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ میں نے اسی زمانے میں ان کی کئی کتب میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھیں۔ زرد چہرے، تکون نادیں، چالیس گروہ بھکاری، کچھ غم جانان کچھ غم دوان۔ اور "چور بازار" سب نے نہ صرف میرے ذہن، بلکہ اس دقت قلمی رسالوں اور روایتوں کے لئے جو بچکانہ چیزوں لکھتا تھا، ان کے اسلوب پر بھی گہرا اثر ڈالا۔

ابراہیم جلیس بظاہر افسانے لکھتے تھے مگر اصل میں یہ افسانے انسائیے اور طنزیے کے درمیان کی کوئی چیز ہوتے تھے، پلاٹ ڈھیلا ڈھالا، اگر دار مخصوصی سیاسی سماجی تصورات کی کھوٹیاں، واقعات طنز کو انجامانے کے سلیلے نہ کوئی موڑوں کے فطری بہاؤ کا منطق نہیں — اس دور میں اس طبع کی چیزوں خاصی مقبول تھیں۔ خواجہ احمد عباس کے افسانے بھی افسانے کم سی اسی خطبات زیادہ ہوتے تھے۔ طنز کا ہتھیار کرشن کے علاوہ مٹوار، عصمت یہاں بھی استعمال ہوتا تھا۔ ابراہیم جلیس کے افسانوں میں جذبائیت کے ساتھ اس کی حلیف بلند آہنگ خطبات بھی نہیاں تھیں۔ جو اس زمانے کی ترقی پسند اور ریاست پسند شاعری کا فضوس آہنگ تھی۔ اس کی تقلید آسان تھی جہاں تک بھے یاد ہے اس زمانے میں ترقی پسند رسائل کے علاوہ راست کے ملودگی پسند رسائل د جوانہ میں بھی

اسی تماش کے مفہوم نہ اپناؤں، یا اپنے نہ انسانوں کی بھرمارتھی۔

ابراہیم جلیس (پیدائش ۱۹۲۵ء) اس وقت ۲۱ یا ۲۲ سال کے ہوں گے۔ اس کم عمری میں انہیں جو مقبولیت میں اور ان کے اسلوب نے جس طرح مقلدوں کی، یک بڑی تبلیغی کی دہ ادب کی دنیا میں حیرت ناک داتھے۔ یہ صیغہ ہے کہ ان کا اپنا اسلوب کرشن چند، قاضی عبد الغفار، ترقی پسندی، صحافی طرزِ نک، خطابت احمد دہلوی بہت میں چیزوں کا ملغوبہ تھا۔ لیکن یہ کیا کم ہے کہ انہوں نے اسے اس ذہنی، طبی اور ادبی کم عمری کے باوجود کم ازکم ریاست میں سب سے مقبول و موثر اسلوب بنادیا تھا۔ اس لحاظ سے جلیس کی اٹھان ادبی معجزے کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ اپنے سے کہیں زیادہ باعلم، اکبہہ مشق، عمر، سیدہ اور ادبی طور پر پختہ شعور دانے ادیبوں شاعروں سے کہیں زیادہ مقبول تھے بعام میں بھی اور لکھنے والوں میں بھی۔

ابراہیم جلیس کی اس بے پناہ اپیل کا سبب میرے نزدیک ان کا روگہر انسانی جذبہ تھا جو جذبہ اتنی انداز ہی میں سبھی ہندستان اور ریاست کے معاشرے کی سماجی خرابیوں اور غلامی کے دور کے استعمالی سامراجی نظام معاشرت پر طنز کرتا تھا۔ سیاسی اور معاشرتی حالات دامر ارض کا یہ احساس نہ ترمذیب کا پابند تھا نہ علاقے کا اونڈ کسی مخصوص سیاسی نظریے کا۔ اس میں ہمہ گیر سچائی اور تاثیرتھی۔ اسی نئے جلیس مختلف سیاسی عقاید اور اگل اگل معاشرتی نظریے رکھنے والوں میں یکساں مقبول ہوتے۔ ان کی ذہنی ترمذیت بڑی حد تک مل گزدہ مسلم یونیورسٹی کے اس ماحول میں ہوئی جو آزادی سے قبل قوم پرستی اور ترقی پسندی کے ساتھ علحدگی پسندی کے تصویرات کی بھی آماجگاہ تھا۔ جلیس کے یہاں یہ تینوں میلانات گذرا ہو گئے۔ مگر ان پر زیادہ نمایاں اثر ترقی پسند تصورات کامہا۔ وہ دریان میں کچھ مدت کھلتے بھی گئے تھے ساتھ اور با جرہ مسرود کے ساتھ فلم میں قسم آزمائی کرنے۔ مل گزدہ کے سماں بیاری اثر کو بھی کے ترقی پسندوں کی صحبت اور رفاقت نے اس طرح ترااث کا سماجی شعور اور آفاقتی انسانی دستی کی دھارے زیادہ تیز ہو گئی۔ دوسرے پہلو اس دھار کے پیچے چھپ گئے۔

مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے ابراہیم جلیس ریاست کی رفوا کارخانیک سے تعلق کی بناء پر اس وقت ترقی پسند ملقوں میں معتبر ہو گئے تھے۔ وہ زمانہ ہی تضادات کا تھا۔ بلکہ مجھے یہ عرض کرنے دیجئے کہ آج تک بھی ہمارا ادب اور سیاست، علم اور معاشرتی شعور تضادات میں گم ہی۔ اس عتاب کا شکار جلیس کے بعد عصمت، نٹو، عباس، ناصر، ہیات اللہ انصاری اور بہت سے ادیبوں ہوئے۔

جلیس پولیس ایکشن کے بعد پاکستان چلے گئے۔ ان کی یہ فراری (ہجرت)؛ ان کے ادب کے ترقی پسند کرہا پر ایک۔ اور داروغہ بنادی گئی۔ بنشہ کے ابتدائی برسوں میں ان کی کتاب "دکھ ایک کہانی چھپی" جس پر حیدر آباد میں بڑی لے دے ہوئی۔ اس میں سیاسی حالات کے علاوہ افراد اور شخصیتیں بھی معرفت بحث میں آئی تھیں۔ حیدر آباد کے ترقی پسندوں کے دشائی تھے لیکن پاکستان میں ان کو مدد ترقی پسندوں ہی سے ملی۔ یہ رپورٹ تازہ، نیم ادبی، نیم صحافی انساز کی یک رفتی دستاویز ہے لیکن ادب میں اس کی تاریخی اہمیت اتنی ہے جتنی تباہ راجہ دہلوی

کی، دلیکی پتتا، اور اسی ذہینت کے دوسرے پورتاٹوں کی — اس کے کچھ برس بعد ہی انہوں نے چین کا سفر نامہ شائع کیا۔ اب کی اس پر ترقی پسندہ حلقوں نے جنپی لذتیت کا لازم لکھایا، وہی لازم جو عزیز احمد کے نادلوں خصوصی گزیز پر ہاید ہوتا تھا۔ میکن اسی میں شکر جیسی کو اعزز احترام کے باوجود بیس کی تحریر پڑھتے سب شوق سے تھے، بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا مگر جیسہ، آباد کے ترقی پسند اور جست پسند بھی اپنے صحافی سے جیسکی ہوئی اس بھیڑ کی آواز کے منتظر رہتے تھے۔ انجی تک جلیس کے قلم کا جادو حیدر آباد والوں کے سر پر چڑھا ہوا تھا۔

میں ۱۹۵۸ء میں حیدر آباد گیا، اس وقت میں نے جلیس کی مقبرہ لیت کا ایک اور منیر دیکھا۔ فوجان ترقی پسندوں اور فیر ترقی پسندوں میں یکیں طبقہ پر جلیس کے طرز تحریر کی نفع کرنے والے موجود تھے۔ نہ صرف موجود بلکہ ان میں سے ایک صاحب (ظفر عالمگیر) غثائیہ لوئیڈ میں اپنی طالب علمی اور ادبی تابعیتگی کے باوجود خاصے مقبول تھے۔ جلیس کے ان مقلدین میں جلیس کے قلم کی کاث اور ان کی شخصیت کا خلوص نہ تھا۔ اس لیے یہ سب کے سب چند برس میں ادب کے سین رواں میں کاغذ کی کاث کی طرح گم ہو گئے۔ البتہ جلیس کے طرز تحریر کو صرف ایک ترقی پسندہ افسانہ نگار نے زندہ رکھا اور وہ ہیں — "عائق شاہ"۔ جو عمر میں جلیس سے دو سال بڑے لیکن ادبی شہرت میں ان سے جو نہیں۔ عائق شاہ ترقی پسندی کے معاملے میں بھی راستہ العقیدہ ہیں۔ اس کے ادبی انطباق کے عوامل میں بھی، وضعدار اور اسلوب بیکارش میں بھی مستقل مزان۔ ان کے کئی افساوی مجموعے اور پورتاٹ شائع ہو چکے ہیں۔ وہی انشائیہ نما افسانے، وہی طنز آئیز جد باتیت — مگر ان کی شخصیت اور فکر میں جلیس کی طرح آنکھادات اور انجامات نہیں — لیکن ادیب کی وصت اور شخصیت محض یہ سمجھی، یہ مقصودی اور، حیث خیالات سے تھیں نہیں ہوا کرنی۔ جلیس کا اسلوب کرشن چند کے طرزیہ انشائیہ اسلوب کی بازگشت ہے، مگر اسے جلیس نے اپنی شخصیت کا آہنگ دیا ہے۔ اس شخصی آہنگ کے بغیر ادب ادب نہیں بتتا۔

جلیس نے بعد کے برسوں میں افسانے سے تقریباً قطع تسلی کر دیا۔ ۱۹۵۸ء سے قبل ان کا ایک اور مجموعہ چیلک سیفی ریز ریز چھپا۔ اس کے بعد ان کا کوئی مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ ممکن ہے شائع ہوا ہو۔ پاکستان جانے کے بعد ان کے قلم کا رُخ اس ملک کی سیاست و معاشرت کے مضمون، اور بیمار پہلوؤں کی تفاکشی کرنے لگا۔ ان کے بعض افسانے اس دور میں انشائیہ کی سلسلے سے اٹھ کر غالباً تحقیقی افسانے کی سطح تک پہنچے۔ عنوان مجھے یاد نہیں، ایک کہانی میں انہوں نے کراچی میں مکان کی عدم دستیابی کے سبھے کو بڑی خوبصورت اور طنز کی کاث کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ایک ادھیڑ عرصے کے میں و مخفی بندگ ایک عورت کے ساتھ کسی چیلک مقام پر مصروف اختلاط پائے جاتے اور گرفتار ہوتے ہیں — بعد میں پتہ چلتا ہے کہ یہ عوامل عاشقی کا نہ تھا، بلکہ برشتہ ازدواج میں بندے سے ان بزرگوں کو ایک کمرے کے گھر میں جوان بیٹوں بیٹیوں اور دہڑے افراد خاندان کی موجودگی میں انہیں عشق کا موقع نہ ملتا تھا۔ جلیس افسانہ نگار کی حیثیت سے جب اپنے فن پر قابو پا رہے تھے، معاشی ضروریات نے ان سے یہ میدان چھڑا دیا اور انھیں اخباروں کی کامل نگاری کے لیے خود کو مستقل وقف کرنا پڑا۔

جلیس افسانوں کے کئی مجموعے شائع کرنے کے باوجود افسانہ نگار کی حیثیت سے کوئی خاص مقام نہ بن لے کے اس نے کہ ان کے میسٹر مجموعے ابتدائی عصر کی کاڈیں ہیں۔ ان کا ایک نادل "چودبازار" بھی عنوان شباب بھی کا ثمرہ ہے۔ اُنہوں

بادل کے کسی تذکرے میں اب تک میں نے اس کا نام نہیں دیکھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا جلیس کی مقبولیت و شہرت محسوس فتنی تھی؟ اور ادب میں ان کا ذکر کس عنوان سے ہو گا؟ جواب آسان نہیں۔ ان کی مقبولیت میں وقوعی سیاست، نعرہ بازی لکھنخدا، جذباتیت اور دوسرے بہت سے نوافل کا دخل تھا۔ لیکن یہ خواں دوسرے بہت سے ہم ملڑ، ہم حصر ادیبوں کو اس شہرت کا عذرخواہی نہ دلا سکے۔ کیوں؟ اس لیے کہ کسی کے پاٹ جلیس کی شخصیت کی تواتری اور ان کے اسلوب کی طنزیہ دعائیہ تھی۔ جلیس بنیادی طور پر طنز نگار تھے۔ اس حیثیت سے ان کا نام اور وہ کے طنز نگاروں میں نمایاں میثیت کا حامل ہے۔ ان کی جذباتیت مخالف رومانتیزم سے مل کر ایک طرح کا توازن پیدا کرتی ہے۔ وہ رقین القلب جذبات کو نہیں، اُجھارتے بلکہ طنز و سخرے سے معاشرت دیسیاست کے گھاؤ نے پہلوؤں کے خلاف نفرت اور غصت کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ اس نظر سے وہ اندھہ کے بعد میں چند احتجاجی ادیبوں میں سے ایک ہیں۔

جلیس نے برسوں صھافتی طنزیے لکھے ہیں۔ صندوق اس کی ہے کہ ان کا ایک اچھا انتساب برقرار کر کے شائع کیا گیا۔ مجھے لقین ہے کہ یہ انتساب رطب دیا بس کے چھانٹے کے لبند بھی دو میں جلد دل پرستی ہوتا چاہئے اس سے ان کے اولیٰ گتے میں اضافہ ہو گا۔

ڈیلوڈ ہیوم نے تیس برس کی عمر تک فلمے میں اپنا کام ختم کر دیا، اس کے بعد وہ دوسرے میداں میں بیس آزادی کر رہا۔ جلیس نے بھی ادب پر سمجھی گئی سے توجہ زیادہ عرصے تک نہیں کی۔ وہ صھافت کی نظر ہو گئے۔ اور دو ادب میں ان کا مقام وہ نہیں ہو سکتا جو فلمے میں ہیوم کا ہے۔ کیونکہ ان کے ابتدائی ادبی کام میں وہ سمجھی، فتنی کمال اور گہرائی نہیں جو کسی تحریر کو اونچا مقام دلاتی ہے۔ کیونکہ اورد الیسو، غریب، ناقہ زبان لکھی ادیب کے لئے یہ بھی کسی طرح کم نہیں کہ ایک شخص نے اپنی جوانی کے بعد ہی میں اپنے قلم کا سکر چلا کیا اور اپنے مقلدین پیدا کئے۔ اور چھرا پتے قلم سے ہی روزی کہا تاہر پہلے مجھے لقین ہے کہ پاکستان کی اور وہ صھافت جلیس کی موت سے بہت غریب ہو گئی ہوگی۔ اور صھافت دیے بھی بر صنیع میں صلاحیتوں سے بہت مالا مال ہیں۔ طنز نگاری میں جلیس کے پایہ کے صحافی ہندستان میں بھی نہیں ہیں۔ ان کا نام س صنف کے الابر میں لیا جائے گا۔ مولانا عبد الماجد دیبا بادی، فاضل عبد الغفار، ظفر علی خاں، چرانی حسن حرفت، شوکت تحانوی اور مجید لاہوری کے ساتھ — ابراہیم جلیس کو میں نے چھٹے دہبے کے آخری زمانے میں دیکھا۔ وہ پہلی بار حیدر آباد آئے تھے، ان کے اعزاز میں جلیس اور شیخی مظاہن بیکھے جا رہے تھے۔ کبھی دوبارے میری جلیس سے شخصی طاقت اپنی شایدہ ہو سکی لیکن ان کی تحریر میں کا جو نقش بھپن کے نامختہ زین نے قبل کیا تھا وہ اس وقت بھی گہرائھا، اور اب تک قائم ہے۔ جلیس کے دو بھائیوں سے ذاتیہ رام نے اس ادبی تعلق خاطر کو ذاتی تعلق بنا دیا۔ محبوسین جگجو ان کے بڑے جمالی میاست مکھ تحریر کب دیر حیدر آباد میں میرے دو بعد کے ذمہ نے مجھ پر شفیق رہے۔ ان کے چھر نے جمالی جعیبی حسین یونیورسٹی میں میرے محضرا اور دوست تھے۔ بعد کے برسوں میں ان کی ادبی شہرت نے جو تھوڑا اس فاصلہ تھا اسے بھی مدد دیا۔ اس اعلیٰ کی بنا پر جلیس کی موت کی خبر میرے لئے ایک ذاتی نعمان کا احساس بن گئی۔ اور وہ کے ہر ادیب اور شاعر کی موت ہمارا ذاتی نعمان ہے۔ جلیس کے معاملہ میں یہ احساس زیاد اور بڑا ہوتا ہے، اس کا لیکہ اپنی اپنی غیر مخلوق اولیٰ صلاحیت تحریر سے کام لینے کو پورا موت نہ ملا۔ اگر وہ صھافت دیسی است کا فشنکار نہ ہوتے تو اور وہ کو سرف (Serv) کے پایہ کا طنز نگار میں سکنی تھا۔ پھر بھی انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اتنا ہے کہ سمجھتے افراہ نگار، طنز نگار، اور صھافی، اور وہ انہیں مدد لئی ذرا کوشش نہ کر سکے گی۔

شیم احمد

ابراہیم بیس کے دو روپ رتار

ایم اسے اور وہ کہ سال آندر ۱۹۷۸ء میں جسے بھی تحقیقی مقابل استھان کے لئے، نس کرنا تھا، جس کا موضوع تھا، صفت و فیض کاڑ اور دو۔ بیس کے ان دونوں روپوں کا اور تاریخ دلکش، ایک کہانی اور جیل کے ہوں، جیل کی راتیں پر زیرِ ذمہ، اسی مقابل کے مختصر اقتباسات ہیں۔ ان تصوروں کی اشاعت بھتی ساحب ہی کے حکم ہائیجس ہے، اور نہ بیس جیسے مصنف پر الیکٹریک تحریر میں شائع گرا۔ کامنگ جرأت نہیں کر پاتا۔

اگر معاذ قادرین کو ان تحریروں میں کوئی اپنی اور قابل قرین بات تقریباً تو اسے بلا تکون اور بے بُخل میرے حساب میں دلکھا گئے اور کوتا ہجوس امامیوں دغیرہ کے لئے بے محجوب بھتی جیسی کی مگر دن نابی جائے۔ (شیم احمد)۔

”دو ملک، ایک کہانی“

ہندوستان کی قیمت کے بعد، حیدر آباد کی جس مخفیوں کیلکش کا شکار ہوا تھا، اس پر ابراہیم بیس نے ایک بڑا خوبصورت اور موثر درپرداز دلکش ایک کہانی کے نام سے لکھا، وہ کے نصوص دمنفرد اسلوب کا آئینہ دار ہے۔ اس درپرداز میں بیس نے قدم قدم پر طنز کے تیرہ نشتر پہنچے ہیں۔ اس روپرداز کا موضوح ہی ایس ہے جس کی وجہ سے بیس کا بہبوبی پناہ تجھ دترش ہو گیا ہے۔ ا پہنچ مخصوص نہایتی موضع کی وجہ سے یہ روپرداز اس وقت کے حیدر آباد کی نہ صرف ایک ونڈہ جا دیدا ریخ بن گیا، لکھ بے مثل فخارانہ خوبیوں کے سبب اسے ایک ادبی ستاہکار کا درجہ بھی دیا جاسکتا ہے۔ روپرداز کے صفحی ارتفاع کے سلسلے میں ابراہیم بیس کی یہ تحریر یہ یک سفر اسحاق بھی پیش کرتی ہے۔

ابراہیم بیس نے ”دو ملک، ایک کہانی“ میں حیدر آباد کے اس وقت کے سیاسی بحران کا پرواعاکہ کیا ہے وہ خود بھی اس میں ایک اہم بلکہ مرکزی کردار کی حیثیت سے موجود ہیں۔ ابتداء تو میکونٹ پارٹی کے ہمدرد اور اجنبی ترقی پسند مصنفوں کے ایک اہم اور سرگرم

وکل نہ تھے۔ لیکن آئیم کے بعد بندوستان اور پاکستان میں مختلف مقامات پر جو فرقہ وارانہ نشادیت ہوئے اور جن کے نتیجے میں بڑھنے پہنچنے پر بھٹ کا قتل و قارت گری، آتش زدن اور حورتوں کی بے حرمتی کے باذ اور گرم ہوتے تو اس میں ابراہیم جلیس گی۔ میں گزار دی کی تھیں جتنے بلیس جہاں کو۔ بھی ”کیونٹ پارٹی“ سنگھ امرتسر کے چوک سے بیچوں نیچے مادرزادہ تھے۔ کیا الیا اور اس کی خصیت دوہی کی تھی۔

ابراہیم جلیس اس رہاوٹ کے برداشت نہ کر سکے اور ان کے ذہن پر ایک بزرگی دست چھٹ پڑی اور اپنے ول دیدار پر قابو نہ رکھ سکے۔ اور کیونٹ پارٹی اور انہیں ترقی پسند مصنفین سے ناطق نزد کرائجیں اس کا دلسلیں اور رہنمای خحریک میں شامل ہو گئے۔ جن سے کبھی، فبی نظرت تھی اور جن کی وہ کھل کر مخالفت کرتے تھے۔ اس دادت کے بعد وہ ان کے بزرگی دست خاتمی۔ مودود اور سرجم دکن بن گئے۔ ابراہیم جلیس نے اس کتاب میں جن مالات کو پیش کیا ہے وہ بڑے عہت انگیز ہیں۔ انھوں نے بندوستان کے ملازم پر اور مسلمانوں کے بندوں پر مقام کی داستان بڑی تکمیلی اور جذبات انگریز کے عالم میں سمجھی ہے۔

”دو ٹاک“ ایک کہانی ابتداء سے لے کر آخر تک کئی مراحل، کئی سائل اور مختلف نظریات کی ترجیحی کرتی ہے۔ اس میں جو کہانی پیش کی گئی ہے وہ تین بڑے حجتوں میں بانٹی جاسکتی ہے۔ ہر جسکی مختصر ابوجہ پر مشتمل ہے۔ بندوستان کی آزادی اور اس کے بعد جو حالات جید رہا ہے اسی رہنا ہوئے انہیں ابراہیم جلیس نے ایک محبت دلن اور ترقی پسند ادیب کی نظر سے پیش کیا ہے۔ ان کے بیان میں معنفہ کا نظریہ نہایت واضح، صاف، صحمند، اور ترقی پسندانہ ہے۔ ابراہیم جلیس کا یہ ہر زنگر کتاب کی تہیید اور پہلے ہب بعنوان ”ہر جو ٹی یا بر وفادار سے شروع ہو کر نصف ہب بعنوان ”زبر کے ناجر“ تک برقدار رہتا ہے۔ بیالہبک وہ دلن دوستی کے مذہبات سے سستار نظر آتے ہیں۔ وہ بندوستان کی آزادی کا خلوص دل سے استقبال کرتے ہیں، جسیں آزادی کا مڈا جسین نقصہ کہنی پڑتے ہوئے آزادی کے حصول کے اسباب پر رہنی ڈاستے ہیں اور دکھاتے ہیں کہ کس وجہ وجہ اور ہانفی کے بعد ایک طویل المدت خلا مانہ زندگی کا فاتحہ ہوا۔

”ڈبڑھ سو سال تک ہمارا بد نعییب و میں غلامی اور تیرہ بھنگی کے اندر ہرے میں اندر ہے کی طرح رستہ ٹوٹا پھر ربانخا، اس اندر ہرے میں گور سے قزاق اور سفید چڑی والے ڈاکو اوسے قدم قدم پر لوٹ رہے تھے۔ اس کا سیدھا عارستہ تک چھاپکے تھے۔ اس کی سترل پر بھی ناجائز قبضہ کے نہیں تھے تھے۔ مگر جلیانوالہ باغ سے، کانگریس ہاؤس سے اسلامیک آفس سے، کیونٹ پارٹی ہسید کوارٹر سے، داکوؤں کا ہر جگہ بڑی دلیری سے مقابلہ کیا۔ انھوں نے اپنے ہوئے رات کی سیاہی دھونی شروع کی، اپنی پڑیوں سے اندر ہرے کو کھڑکیا۔

۱۔ مرحوم سینا اربیت مجھے ایک خط کے ذریعہ یہ اطلاع دی تھی کہ ابراہیم جلیس کبھی کیونٹ پارٹی کے ممبر نہیں رہے دشیم، ہر دلکشا ایک کہانی میں مرت ۲

۲۔ دو جگہ ایک کہانی میں جلیس کے الفاظ بہی میں انہیں ترقی پسند مصنفین اور کیونٹ پارٹی آنس سے باہر نکل ہیا۔

مشروع کر دیا، اپنے چہروں کی چمک اور درخشندگی سے کہ ایک بیسا سورج بنایا۔ جو ۳ اگست ۱۹۴۷ء کا نتھیہ ہایا ہے طور پر جس کی تمازت کی تاب نلاکر ٹھنڈے ہوں کے گورے قراقہ سر پر پاؤں رکھ کر بدل گئے تھے۔

اس طرح اضورت میں جگہ جگہ انگریز سامراجیت کے لئے نظرت کا، انہا رکیا اور اس پر جہاں بھی موقع ہاں بھر پوڑا، طنز کیلئے آزادی کی جیوی کوشش آمدیہ کیا اور شہنشاہ پرست ذہنیت، رضا کار تحریک، قومی تصریح اور حیدر آباد کی خود منماران اور ایذا ایجاد کیتے ہوئے تھے اور طنز کے چھتے ہوئے ہوئے داروں سے کام لیا اور ملکی وحدت، فرقہ واراً اتفاق اور ایک قومی نظریہ کی محمل کر تبلیغ کی ہے لیکن اسی اب (ذہر کے تاجر) کے نصف آخر سے ان کا ذہن ایک مرتبہ تبدیل ہوا ہے۔ ان کے سامنے نظریات بدل باتے ہیں وہ کیونٹ پارٹی اور انہن ترقی پسند مصنفین سے ناطق توڑ کر، تعداد اسلامیں اور رسلماً تحریک میں شامل ہو جاتے ہیں، یہ کتاب کا ایک ذبر دست مرتبہ۔ یہاں تک فرقہ پست، رضا کار تحریک، حیدر آباد کی خود منماران، حیثیت اور دو قومی نظریات کے مقابل نظرت کا ہو ذبر دست جذبہ تھا اب بدل باتا ہے۔ اس مرحلہ پر رضا کار ابراہیم بلیس کا جنم ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ سب باتیں ان کی زہنی ساخت کے تلفی بر عکس اور منافی نظر آتی ہیں۔ جن کی وجہ سے وہ رُک شدیدہ ذہنی خلشار اور کرب، نفسیاتی الیعنی اور جیپیش میں مستلزم نظر آتے ہیں۔ ان کے سامنے زندگی کا کوئی مانع اور رکشنا راستہ نہیں رہتا وہ راہ کی چھپیدگیوں اور انہی چہروں میں ملک روڈیاں مارتے نظر آنے لگتے ہیں۔ جس کا اظہار وہ خود جا بجا کرتے ہیں۔ ان کے ملکہ دماغ میں ایک رسمہ کشی کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، ایک طرف وہ ان تہم بازوں سے متفرج اور بد غصہ بھی نظر آنے لگتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف مغلی طور پر وہ ان کے ساتھ تعلادن بھی کرتے اور ان کے ساتھ ساتھ چلتے تھے تھے۔ اس طمع نظریہ اور عمل کے تفاصیل کی وجہ سے وہ ذہنی تذبذب میں بستلا نظر آتے ہیں، اس نے اس کتاب کو دس نقطے پر بجا کر ایک ذبر دست مورثے ہمکار کر دیا ہے۔ پوری کتاب کی تقدیمیت کا اسکفار اسی چھتے پر ہے اور جس انداز میں یہ گریزہ ہے، وہ قاری کو بھی سزا فراہم کرتا ہے۔

اور جس دن میں نے یہ سُناؤ میری ملی گذشتہ کام بیت بلیس جہاں کو ماؤنٹ بیسٹن چان نے جبل سے جھکا کر کڑھ جیں سنگو امرت سر کے چوک کے بھیج گئی تھی مادرزادہ نکار کر دیا ہے..... اس کے سرخ و سبزہ جسم، اس کے بور جیسے جسم کو بھی ہو کر رکھ دیا ہے تو میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں یک بیک مسلمان ہو گی، غیور مسلمان، فائزی مسلمان، مجاہد مسلمان یا... میں بھی ذہر کے ہاجروں کی روٹی میں شامل ہو گیا۔ میں نے ہر ہفتے فرقہ واری تعصب کا ذہر زیچ پیچ کر کیا ایسا تو کچھ نہیں، البتہ میرے سفلی بذہات کو بڑی تکلیف ہوتی تھی.....

اس اقتباس میں ابراہیم جلیس کی شخصیت آئندے کی طرح ہمارے سامنے آ جاتی رہے۔ اس کتاب کا یہ بہت ہی اہم اور غیر معمولی ذہیت کا حصہ ہے۔ کچھ نگہ اس سے پہنچ جو کہاں یا تو چیز، جو خیر یا بُحوبیات اور جو خالص تھے وہ ایک ایسے نزق پسند ادب کے تھے جو مذہب کی بنیاد پر فرقہ دارانہ منافع سے نفرت کرتا ہے اور مذہب اور ایک با عمل فرد ہے۔ جو بلاد فرقہ مذہب دلت، رنگ دنس، قوم و زبان، مذہب کا ادب ہے اس کا پسندیدہ فنکار ہے جو مذہب کے قریب اور مذہب کی فوٹپیں میں بہ ابر کا شریک ہے جو اپنے وطن کی آزادی سے خوش ہوتا ہے۔ لیکن یہ اقتباس اس کتاب میں ایک ایسی کیفیت پیدا کر دیتا ہے اور اس سے نظریات اور خیالات میں بھی زبردست صورت آتا ہے۔ ایک ادب کی شخصیت، اس کے متن خود و نظر، اس کے طرزِ عمل، ان کے نظریات، خیالات، اس کے پیغامات، اس کی وطن پرستی اور اس کے درجے قومی اور مین الاقوامی نظریوں کو یکسر، خیالات کس طرح بدل ڈالتے ہیں، اس کتاب سے اس کا پچہ و اندرازہ ہو جاتا ہے اور بالخصوص کتاب کے اس صورت سے۔ ابراہیم جلیس کی شخصیت، کچھ سے کچھ کیا اور کیسے ہو جاتی ہے۔ ان ہاتوں کو بھی اس جمعتے میں بخوبی دیکھا جاتا ہے۔ اس عظیم تبدیلی کے دعاء سے مر جانے کے بعد بھی، اس کتاب میں وہ ابراہیم جلیس ملتا ہے، جو کچھ چھپتا ہے، بلکہ اپنی ذات کو تندید و ملامت کا نشانہ بڑی بے باکی سے بنایا ہے۔ اس طور پر ابراہیم جلیس نے وہ کافک ایک سمجھاتی میں خود تعریف کیا ہے۔ اعلیٰ معیار پیش کیا ہے وہ اور دو ادب ہیں فال فال ہی سلیے گا۔

کتاب کے اس موڑ کے بعد جو کہاں اور دا انگریز اور عرب تاک کہاں ہیں، ان کے مقام سے ابراہیم جلیس کی ذہنی تکشی فیضی ایجن اور شدید اور بدترین جذبہ باتیت بھی پورے طور پر آ شکا ہے۔ اور بعد کو تمام کردار بلوں، غلبہ اور کوتاہیوں کا اعتراف بھی بڑی بے باکی سے کیا گیا ہے۔ ادبی نقطہ نظر سے اس بات کی جتنی علی تعریف کی جائے کم ہے۔

دو ٹک کا ایک سمجھاتی ہے کہ دوسرا حصہ باب بعنوان سرخ ستارہ۔ تاک جاری رہتا ہے، اس میں انھوں نے حیدر آباد کی رہنمائی کا رخیز کی، افریقا پروری، معاشی اور اقتصادی ناکہ بندی، نظام کی لغزشوں، پولیسی ایکیش اور جمیع آباد کی اندھیں زینیں میں شکوہیت کی داستان بڑی تفصیل اور بڑے بند باتی انداز میں پیش کی ہے۔ دوسرے اور تیسرا ہے جمعتے کے درمیان خوش رہو اہل وطن اور انہیں یا "ایران" یا "ایران" سے اس کتاب کے درمیانی ابواب ہیں۔ جو ابراہیم جلیس کی رو پر مشی حیدر آباد سے بھیثی کے لئے روانگی اور وہاں سے پاکستان کے لئے اجرت کے بیان پر مبنی ہیں۔ ان دونوں ابواب کا تعلق خاص ان کی ذات سے ہے۔ ان میں وہ فزاریت کے شدید تکار نظر آتے ہیں۔ کبھوں کو انھوں نے ایہ اندھیا کی اپر ہوئیں میں جروں کی دلکشی سکراہے۔ اس کی گھینزی زلغوں اور اس کی آنکھوں کی چمک میں اپنی ذہنی کشمکش اپنی پہ ریشا نیوں اور اپنی انہیں کامہ او اتنا شکر کرنا پاہا ہے۔ انہیں زینیں اور زینیں کے حسن یہاں کی دلکشی اور یہاں کی ہنگامہ خیزی سے نفرت ہے جو مباہت ہے اور وہ خلاری میں ابدی سکون و قرار کے متناہی نظر آتے ہیں۔ اس سے ان کی شدید ذہنی کوفت اور کربنائی کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے۔ بیکن اس کے رد عمل کے طور پر جب وہ ہس جروں میں دلپی سیتھے اور اس سے اپنی صفت کرنے کی۔ کوشش کرنے نظر آتے ہیں تو فراری جذبہ صاف جھکتا نظر آتا ہے۔ وہ ہس جروں کی جانب ملتفت نگاہوں سے دیکھتے ہیں اس کو ایک مدرس اور پاکیزہ ہمیشی سمجھتے ہیں۔ کچھ نکد وہ زینی پر نہیں رہتی۔ آسمانی مفاڑوں میں اوجاتی ہے اور جو نکد ابراہیم جلیس

کو رہی تھے نظرت سچے اور اس نظرت کا مداد ادا کرنے کا خواہ کرتے ہیں اور یہاں انہیں مس جرس کی خیت میں بھرا سکت اور قرار طلب ہے اس لئے وہ اپنے اس نظرت کی خاطر میں جرس کو پون رافی۔ فضاؤں کی ملکہ اور کوئی آف دی ایجنس بیسے رہ مانی خدایات عطا کر دیتے ہیں۔ وہ میں جرس کی سحر آفرین شخیت کے مناسب اور پرکشش طبعوں میں گرد بجتے چلتے جاتے ہیں۔ وہ دنیا کے تمام بُلاؤں سے بھاگنا پا سکتے ہیں، اور انہیں اُر تھر اندھیا مختبلے میں ایک اندھا زیادہ پیسکوں، خوشبوار اور ان کی جگہ نظر آتی ہے۔ جہاں، مندر اسجد، ہبی، محل اور جھونپسڑی قوم پرستی اور فرد پرستی اور سیاسی شبکہ گردی دکھائی نہیں دیتی، بلکہ میں جرس جرس جرس ہی نظر آتی ہے جو بہک و فتن فضاؤں کی ملکہ پون رافی اور کوئی آف دی ایجنس ہے اور یہاں تک کہ اس کی شان ایک تعیہ سے کے نزول سے بھی نہیں پچھا جاتی۔

بُلاؤں کی بُلاؤں میں جرس
بُلاؤں کی بُلاؤں میں جرس
بُلاؤں کی بُلاؤں میں جرس
بُلاؤں کی بُلاؤں میں جرس

اس شبید فراریت کو کوئی بھی پا شور قاری پسندیدہ نظر دی سے نہیں دیکھے گا۔

دو ہلکے ایک بھائی کا غیر احمد آخوندی دو ابواب اسلامی مملکت کے در داڑے پر اور ایک جلوس پاکستان۔ پہنچنے کے بعد دہاں کے سیاسی، سماجی، معاشری، اخلاقی اور ادبی مسائل کوہنڈ کرے پرشل ہے۔ ان میں پاکستان کے ادبیوں کی سیاست اور دہاں کی ادبی سرگرمیوں کا سیرہ عالیٰ ہے یا گلابیاں دو خود اپنی متزلزل اور غیر ہمار شخیت کی تغوری کشی بھی خوب کی جاتی ہے۔ یہاں ان کی شخیت اور بھی الجھی ہوتی ہیچ پیدا اور نسباتی کٹکش کی شکار نظر آتی ہے۔ یہاں دو مختلف راجبوں اور نظریات کے درمیان متعلق نظر آتی ہے۔ پھری زندگی میں دو مختلف را یہیں اور دو مختلف تفریات اپنائتے۔ اور اب بہاں کوئی تغیری راہ ان کو نظر نہیں آئی۔ اور چونکہ یہاں واسطہ زیادہ تر ترقی پسند ادبیوں سے پڑا، اس لئے وہ ان کے سامنے باتی ہوئے بھیجتے ہیں۔ جبکہ ان سے ہے بغیر بھی کوئی پارہ نہیں، ایسی حالت میں وہ ذہنی اُبھیں اور نسباتی کٹکش میں شدید طور پر مبتلا نظر آتی ہے۔ اذ بذب کی کیفیت یہاں بھی خطرناک صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کے کسی دارجہ اور صاف نسب العین کی تلاش میں سرگرد ہاں ہیں، لیکن اس میں انہیں کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، اس ادھیریوں میں وہ سارا سارا دن اور رات رات بھر لاجور کی سڑکوں پر بے مقصد گھومنتے رہتے ہیں۔ ترقی پسند ادبیوں کے ساتھ انجتھے ہیجتے ہیں، لیکن چپ پچپ، بچھے بچھے احمد پیشان پیشان ان سے نظریں ہمار کرنے میں مشرانے اور کترانے ہیں، یہ صورت یہاں سچ پہنچتی ہے کہ وہ مستقل عبداللہ کاک سے جیپسے لگتے ہیں۔ ان دو نوں ابواب میں انہوں نے اپنی پھری سرگرمیوں پر جنمیں وہ غلط سمجھتے ہیں کھل کر شرمندگی اور ندامت کا اظہار کیا ہے اور اس احساس پیشانی اور شرمندگی

نے انہیں شرورت سے نیادہ صاف گو ادربے باک بنادیا ہے۔ ادب اقتدار سے ہر فاری دس بندپولی قدر کیسے عکلے جھوٹی اعتبار سے روکا، ایک کہانی تھیہ رہا اور کے سیاہی، سماجی، معانی اور اقتداری انتشار، پولیس ایکشن، عوامی دُر گوں حالات، سماں اور تحریک اور انعام، اہمیت کی سرگرمیوں پر مشتمل ہے، اپنی ذہنی کشمکش، نفیقی خلفشار، پاکستان کی زبانی اور اپنے ملک اقتدار اور بدترین بندہ انتیت پر اپنی رپشیاں اور شرمندگی کے ایک قابل قدر تصنیف اور اردو کے چند بہترین رپورٹاژوں میں سے ایک ہے۔ اس میں معنف کی صاف گوئی، صداقت اور حقیقت نگاری، اچھے شدید اور بخوبی نگز ناچراحت، طنز کے اچھے نے، لوزیکے اور پچھنچتے ہوئے نشتر، ستری، نگین، لچی بسی ادبی زبان موجود ہے۔ ان تمام عنابر نگز کر دوڑھک ایک کہانی "لوار"، ایک اہم اور معیاری رپورٹاژ بنادیا ہے جس سے آئندہ کے رپورٹاژوں کی تغییر کے لئے ایک معیاری پیمانے کا معمولی یا جا سکتا ہے۔

"جیل کے دل، جیل کی راتیں"

روڈھک ایک کہانی کی طرح ابر اہم جلیس کی رائے کتاب بھی اپنی مختلف خصوصیات اور خوبیوں کی وجہ سے اردو کے چند عدوں، رپورٹاژوں میں شامل کی جاسکتی ہے یہ ان واقعات پر مشتمل ہے جو خود ابراہیم جلیس کی ذات سے تعقیق رکھتے ہیں، آپنیتی نہ ہونے کے باوجود دوچندی اور وقتی بھرہات کے اقبال کی وجہ سے اس میں خود رُشت کا بہک سارنگ، آج یا پہلے اس کتاب میں جلیس نے فطرہ بندی کے نامے کے ان واقعات کو پیش کیا ہے جن کا مشاہدہ انھوں نے لاہور جیل میں کیا۔ وہاں ان کی ذات پر جو کچھ گزرنا، اس کا مفصل اور دلچسپ ذکر اس کتاب کی وجہ پر میں امناؤ کرتا ہے۔

جیل کے دل اور جیل کی راتیں میں جو نکر چند ہی ایام کا ذکر ہے، اس لئے اس میں کسی فہم کے تاریخی تسلیم پر سوال نہیں احترا۔ اس معاذ سے یہ مکمل آپ بیتی نہیں کہی جاسکتی۔ دوسرے یہ کہ اس میں پیش کئے گئے واقعات کا تعقیق ان کی اپنی ذات سے سفرہ رہے تاہم وہ تمام واقعات ایک غیر معمولی سماجی اہمیت بھی رکھتے ہیں۔ اس میں جیل کے افواع واقعات کے قیدیوں کی حرکات و سکنات کا بڑا اچھہ مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ قیدیوں میں بات بات پر جگڑے، ان کی بد اخلاقیات، جیل کے حکام کے مظالم اور ان کی شخصیتوں کی فروعیت، خود جیل کی ناگفتوں ہے حالات، اشیاء سے خوردگی میں طاثر اور ان کی بد ذاتی جیل کی پہار دیواری میں مقید ہونے کی وجہ سے قیدیوں کے ذہنوں میں بھرمانہ خیالات کی مزید نشوونگا۔ یہ اور اسی طرح کے اور بھی واقعات ہیں جنہیں جلیس نے بڑی ہماریک بیتی کے ساتھ دیکھا ہے۔ ان مشاہدات کے درمیان خود جلیس کی اپنی ذات ہے جیل کی تکالیف کا شدید احساس ہے۔ قیدیوں کی بد اخلاقیات پر اس کا دل کڑھتا ہے۔ ابھی کی اصلاح کرنے کا جذبہ اس کے شریف نفس میں سر اٹھاتا ہے۔ اسے اپنے بیوی بچوں کی یاد تڑپاتی ہے جس کی وجہ سے اس کے دل میں اسی حول سے آزاد ہونے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ یہ تمام ایسی کیفیات ہیں جو نہ صرف ابراہیم جلیس کی ذات ہی پر دوستی والی ہیں۔ بلکہ فرد احمد سماج کے ہاتھی رشتوں کی بھی ترجیحی کرتی ہیں۔ فرد اور سماج کے ان رشتوں کی تکمیلی علاسی ہی کی وجہ سے اس کا ب

ابراهیم جلیس میر

میں وہ تمام عنصر، وہ تمام خصوصیات اور تما نجوبیاں اور وہ تمام شرائط مبینا کئے جو ایک اچھے روپ رتائر کے لئے ضروری اور ایم ہیں میرے زندگی میں کہا کتاب نادل نہیں ہے۔

یکم مارچ ۱۹۵۸ء کو، نہیں ایک قابل اعتماد صدور کی پاواش میں اس دنست گرناٹ کیا گیا جبکہ وہ مشاہدہ ان کے استعمال کا مدرس دیکھنے کی فرضیتے گھر سے باہر آئے ہوئے تھے۔ دوسرے ایک بھائی میں ابراہیم جلیس ایک نہایت بذکاری شخصیت کے مالک ہیں۔ یہ بذکاریت اس روپ رتائر میں بھی موجود ہے؛ لیکن دوسرے ایک بھائی اور جیل کے دن جیل کی راتیں کے ابراہیم جلیس میں غایباں فرقہ ہے۔ وہ ابراہیم جلیس جو دوسرے ایک بھائی میں لاہور کے ترقی پسند ادیبوں سے آنکھ ملاستے جبکتا تھا، جیل کے دن جیل کی راتیں ایں اپنے ترقی پسند ہونے والے پوری جماعت کے ساتھ فخریہ اعلان کرتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ "پاکستان ۱۹۴۷ء" کے صفحہ اول پر ایک بحکم میں وہ ابراہیم جلیس جکڑا ہوا ہے۔ جو ایک ترقی پسند ادیب ہے۔

صاحب بہادر بھر جو نکا اور پوچھا۔

"اگر یو اے پرہوجر لیورا سٹر" ۔؟ (کیا تم ترقی پسند ادیب ہو)۔ "یہ راز دیر اینی آنگلشی۔ (لے کر لفڑی)۔" بچھے پہنچنڈ کی خوف و نفرت سے بھی بھی تقدیر نے ایک نئی قوت عطا کی تھی۔ ان تقدیر نے میرے رُگ و پے میں نیا خون دوڑا دیا تھا اور میرا یقین پختہ ہونے والا تھا کہ آنے والی تسلوں کی دُنیا کو نہ ٹردیں کے ایتمم سے جیتا جائے گا اور نہ شاہ باری جشم کی فوجوں سے اس پر فتح حاصل کی جائے گی۔ آنے والی خابص انسانی دُنیا، صرف ترقی پسند ادیب کے قلم سے بنائی جائے گی۔ (جیل کے دن جیل کی راتیں)۔

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ کی جاسکتا ہے کہ ابراہیم جلیس کا ذہن اور ادبی مطبع نظر دوک، ایک بھائی "جیل کی راتیں" میں بہایت و انجام اور سکھم ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے صاف پتہ چلا ہے کہ اب ابراہیم جلیس کے سامنے صاف اور رکشن راہ اور غایباں منزل ہے۔ جیل کے ہاول کو ابراہیم جلیس نے اس روپ رتائر میں ایک بھرے اور واثق "التعبدہ ترقی پسند ادیب کی نظر ہی سے" دیکھتا ہے۔ یہاں اس کا قطعیہ ثابت اور صحت مند ہے۔ جیل کے غیر انسانی ماوں پر نفرت کے بیکھ اس کا دل ٹوٹتا ہے۔ تبدیل کی بد احتراقیوں سے وہ تنفس نہیں ہوتا بلکہ ان پر ہمدردانہ افسوس کرتا ہے اور ان کی اصلاح کی خواہش رکھتے ہے۔ ساری کتاب میں جلیس کے ادبی مقاصد بہت سختکم ہیں، جس کے سبب وہ کہیں ایسی فیضیاتی "لجمیں" اور کٹھکش کاشکار نظر، ہاتھ پر ہیں کہ "دوسرے ایک بھائی میں اس سے قدم قدم پر لاحق تھی، یہاں اس کا روئیہ بلے انتہا جاتی ہے، اس سے مستقبل کی تابنا کی پر عالم یقین ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ مال سے برگشته نہیں ہے بلکہ مال کی تاریکیوں کو مستقبل کے رکش خطوں سے ختم کر ٹالنے کا خواہش ہے۔ ترقی پسند ادیبوں کے نکھے ہوٹے چند ہمده اور نمائندہ روپ رتائروں میں جلیس کی اس کتاب کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔

مناظر عاشق ہرگز کافی

ابراہیم جلیس کی دو رسائل کاہی

ابراہیم جلیس حبید اردو ادب کے مزاج نگاروں میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ ماقعات کی عکاسی اپنے فطری انداز میں کرتے ہیں کہبے ساختگی کے ساتھ مزاج کا پہلو ابھر آتا ہے۔ ان کے اونٹیں میں انسانی سیرت کا بہت گہرا نفسیاتی مطابعہ ملتا ہے۔ ان کے فن میں تحریر اور ضمکر کو ذخیرہ نہیں۔ وہ بڑی پیور و کاکے ساتھ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی مصوری کرتے ہیں اور پڑھنے والوں کے لئے شائستہ قسم کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ ان کے یلاٹ پیچیدہ نہیں ہوتے ہیں۔ وہ ساختے کی باتوں کو لے کر فنا کارانہ برتنائے ان میں حسن و دل کشی کے پہلو بڑی خوب صفتی سے پیدا کرتے ہیں۔ ان کی زبان سادہ، رعناء اور دلکش ہوتی ہے ابراهیم جلیس کم سے کم الفاظ میں اپنے انکار اور خیالات کو صرف دوسروں تک پہنچاتے ہیں بلکہ قاری کے ذہن پر اس کی ایک ایسی چھاپ بھی چھوڑ جاتے ہیں جو لا زوال ہوتی ہے۔ ابراهیم جلیس کا فن اختصار اور جامیعت سے عبارت ہے۔ اپنی دوسری تحریری مل کے علاوہ ایک سوانح مرکے جواب میں بھی انہوں نے اختصار سے کام لیا تھا۔ مگر اس لوب بیان کی چھاپ یہاں بھی نمایاں نظر آتی ہے۔

سوالات یہ ہیں :

- ۱۔ کیا آپ کا کوئی خوش نصیبِ مضمون ایسا ہے جسے پڑھ کر آپ کی بیگمِ محی مسکانی ہوں؟
 - ۲۔ زندگی نے آپ کو کہاں کہاں دھوکے دیئے؟
 - ۳۔ کیا آپ ہمیں زندگی خراب کرنے کے گرتبا سختے ہیں؟
 - ۴۔ آپ خاتمین کو مزاج نگار کیوں نہیں بننے دیتے؟
 - ۵۔ کیا کبھی ایسا ہوا کہ مزاج لکھتے وقت آپ انتہائی گرب کی حالت میں تھے؟
 - ۶۔ وہ کون سی سچی بات ہے جسے آپ بتا نہیں سکتے؟
 - ۷۔ آپ ہم سے کوئی سوال کیجئے۔
 - ۸۔ آپ کی ذات یا برکات سے کتنے لطفے وجود میں آئے؟
- حوالہ میں ابراهیم جلیس لکھتے ہیں :

"آپستہ" مسلمانوں کے سوالات نہیں ہیں جو سابق کے ملنے "لا جدب" ہیں اسی یہ مشکل یہاں پڑی ہے کہ ان لا جدب سوالات کے جواب کیا دوں؟

بہر حالی میسا کچھ بڑا جوابات حاضر ہیں:

جواب نمبر ۱۔ اس سوال کے جواب کے لیے بیگم کی مدعاگزیر تھی، اس لیے اس سے پوچھا۔

"اے شیخ بخت خاقون، بتا کہ میرا وہ کون سانوں نصیب مضمون ہے جسے پڑھ کر تو "بھو مسکرانی" یہ سوال سن کر وہ نیک بخت خاقون کھلکھل کر جس پڑی اور بولی" تم پر قوہیشہ مسکراتی ہوں، میکن ابھی تک تھارے کسی مضمون پر ایک مسکراہٹ بھی نہیں آئی"

جواب نمبر ۲۔ زندگی سے آپ کی کیا مراد ہے؟ اگر یہ زندگی ہے جو گزار دیا ہو تو پھر حقیقت یہ ہے کہ اس زندگی نے تقدیر ہدم پر دھوکے دیتے ہیں، لیکن اگر زندگی سے مراد کچھ اور ٹبے تو پھر "اس زندگی" نے صرف ایک ہی دھوکا دیا یعنی دعوہ تو بھر سکیں اور شادی کی اور سے۔

جواب نمبر ۳۔ تیرسرے سال کا نہایت مختصر اور نہایت مکمل جواب یہ ہے:

"یہ بولیے"

زندگی خراب کرنے کا اس سے بہتر گرا درکوئی نہیں ہے۔ چنانچہ (اپنے سمجھت) میں نے جس کسی کو بھی پیغام بولنے دیکھا ہے اسے بھی سپتہ نہیں دیکھا۔

جواب نمبر ۴۔ اس سوال کے جواب میں ایک سوال پہلے یہ ہے کہ "کیا خواتین نے آپ سے ایسی کوئی شکایت کی ہے کہ ہم خاتین کو مزاح نکال رہیں ہیں بننے دیتے؟"

اگر انہوں نے کوئی ایسی شکایت کی ہے پہلے

میں اگر عرض کروں گا تو شکایت ہو گی

خواتین کو ہم مزاح نکال کریں بننے دیں، پھر ہمارے مزاح کا مزاح کہاں جائے گا؟ خواتین تو "مجسم مزاح" ہوتی ہیں۔ کوئی "ناکاہر دل آتا" اگر مزاح نکال جی ہو جائے تو پھر یہ تشبیہ کوئی بھونڈی ہے کہ "کریلا اور وہ بھی نیسم چڑھا"

جواب نمبر ۵۔ پیغام بھی تو میں جب بھی مزاح لکھتا ہوں تو انتہائی کرب کے عالم میں ہوتا ہوں۔ بغیر کرب کے یہی مزاح کا تصور ہی نہیں کر سکتا اور یہ میرا ہی مقولہ ہے کہ

"ہر لایز مسکراہٹ آنسو فل سے دصلی ہوئی ہوتی ہے"

جواب نمبر ۶۔ جب میں اس کچی بات کو بتاہی نہیں سکتا تو آپ نے پوچھا ہی کیوں؟

جواب سخت لیں گھانے کا فافی ہوں، لہذا مجھ فتنہ کا آپ سے کوئی سوال نہیں ہے۔

جواب۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ میری "ذات با برکات" "مجاہے خود ایک لطیفہ ہے۔ اب رہایہ سوال کہ اس ذات با برکات سے کتنے لطیفے دھرم آئے، تو ہند سے میں جواب یہ ہے

"جنو بیتے تین موٹت اور پچار نذر"

ابراہیم جلیس کے اس "جواب نے" میں جو طنز اور کرب پوشیدہ ہے اس کا اندازہ ہم بخوبی لگاسکتے ہیں۔ ایک طنز نگار دوسرا سے تلفن کا سالانہ فرایم کرتا ہے مگر خود اندر سے کتنا کرب جھیلتا ہے، ابراہیم جلیس نے اس کا انہمار بڑی انسانی سے کردا ہے۔

ابراہیم جلیس کی خصوصیت نمایاں ہے کہ انہوں نے دنیا بھر کے چھوٹے بڑے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور نہایت چاکر دستی سے بھر لوبہ جائزہ پیش کیا ہے۔

"غندے کے منہ کون لگے یہ آفتاب اس دیکھئے!

"ایک بار دہلی میں ایک بات مشہور ہوئی تھی ہر شام آسمان پر ایک رنگ دار ستارہ طلوع ہوتا ہے۔ وہ باغِ مرشدِ اس عجیب و غریب رنگ دار ستارے کو دیکھے چکے تھے۔ لیکن ایک صاحب اپنے شرف اولیت کو برقرار رکھنے کے لیے بڑے فخر ہے انداز میں انگلی اٹھا کر لوگوں کو دکھا رہے تھے کہ "دہ دیکھو وہ ستارہ ہے"۔

ان کا انداز کچھ ایسا تھا ہیسے دہ سارے جمع پر طنز کر رہے ہوں کہ اسے از صورت دیکھو کہ میں کیسا بیوہ میں رکھتا ہوں۔ جمیں کھڑے ہوئے ایک غندے کو ان کی تصرف اولیت اور ان کی بینائی پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے ان حضرت کو مخاطب کر کے کہا اسے جناب، آپ نے ستارے پر انگلی رکھ دی ہے۔ ہٹائیے نا انگلی تاکہ دوسرا بھی دیکھ سکے۔" جمیں قہیوں کا بھوپھال آگیا اور دہ "صاحب دیدہ میں" بڑے شرمسار گرد جھکائے غندوں کو ادل فول بجھے لکھ کر سلاحدار ہے"۔

تاریخِ مزاج و تلفن میں غندوں کا کوئی درجہ لیم کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ غندوں کو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ وہ اپنی زندگی کے ان گنت دکھوں، غموں اور تکلیفوں کو فخر کا لیوں سے بچتا ہے تھے ہیں۔ غندوں کی نسلیات کی تحقیق کرنے والے عالموں کا کا خیال ہے کہ غندوں میں یعنی کسب و ریاضت سے نہیں ہوتا بلکہ یہ تو خداداد صفت ہے۔

"ایک بار ایک کانا آدمی اور ایک بہر آدمی چوری کرتے پڑا۔ اگر اور حالات میں پیش ہوا۔اتفاق سے مجرم بھی کانا تھا۔ اس نے کافی ملزم کو ایک سال قید با مشقت اور بہرے ملزم کو سب سماں کی سزا سماں تو کافی ملزم نے احتجاج کیا؟ حضور میرا اور اس کا جرم ایک ہی ہے مجھے زیادہ سزا ایکیں دی گئی۔"

مجزریت نے کہا "ہم سب کو ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں"۔
کافی ملزم نے کافی مجرم سے عرض کیا۔

" تو چھر حصور، ہم چشمیں پر بھی چشمِ حیات چاہیے"۔

ابراہیم جلیس کا یہ طنز طفیل نہیں ہے بلکہ سماج کا نامہ ہے۔ بیانِ کشمکش اتنا بھروسی کی داستان ہے۔ اور بڑی ہمدردی کے ساتھ زندگی کے مختلف بہلوؤں کی صورتی ہے۔

انسانی سیرت کا گرافیاتی مطالعہ ابراہیم جلیس کی تحریر کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ایک جگات ملاحظہ فرمائی۔ "ایک سیاسی امیدوار عام انتخابات میں کھڑا ہوا۔ ہر جنہ کو شش لکی اور بیڑا معبے خروچ کیا، مہر کا میا بی کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ مجسروز اور عوام کے پاس گیا اور گرد گرتے ہوئے بولا،

بیار اب تک جوں نے تم پر فسلہ کیا ہے، تم سے جو بے رخی بر قی سے اس کا خڑی بار معاف کر دو۔ آئندہ کبھی ایسا نہ ہوگا۔ میری جان پر بخی ہے۔ انتخابات کا شک صلح میں انک گی ہے۔ ہر راتی کر کے تم مجھے اس احتساب میں کامیاب کر دو۔ یہ کام میں تم سے غفت بھی نہیں چاہتا۔ ذریز بختے ہی تم جو کچھ مانگو گے وہ دو دھا۔

عوام راضی ہو گئے اور اتنے دوست دیے کہ امیدوار کامیاب بھی ہو گی اور ذریز بھی بنے۔ اس کے بعد عوام ذریز کے پس پہنچے۔ حسب وعدہ میں مکان بنوا دیجئے۔ روز گواردلاسے۔ کچھ نقد دیجئے وغیرہ۔

ذریز نے کام کیا تو عوام نے مدی زبان سے اس کو انتخاب میں کامیاب کرانے کا واقعہ یاد دلایا۔ ذریز کو بڑا غصہ کیا اور اس نے پولیس کو جلوا کر عوام کو جیل بیچ دیا۔!

آج کی برسٹی ہوئی آبادی کے بھیں نظر خاندانی منصوبہ بندی پر بہت نمودرا جا رہا ہے۔ لیکن خاندانی منصوبہ بندی کی حرکت چلانے والوں کے لیے ابراہیم جلیس کی یہ دوستین نگاہی دیکھئے۔

خاندانی منصوبہ بندی عرف ضبط تو سید یعنی (اُسان زبان میں) پچ کم پیدا کرد "حرکت کو کامیاب بنانے کے لیے را دینڈی کے چند گنواروں نے — "کنواروں کی انجمن" — کے نام سے ایک تنظیم قائم کی ہے... ہم اس انجمن کی افادیت سے قطعاً انکار نہیں کرتے اور جہاں تک انجمن کا یہ مقصد ہے کہ ملک میں خان، اُن منصوبہ بندی کی حرکت کامیاب ہو، ہم دھن، اُن سے انجمن کے حاصل ہیں۔

یہ انجمن کے خرائیش، ہونے کے علاوہ درازیش بھی ہیں اور ہم اندریش ہے کہ چند دنوں بعد نو یہ انجمن باقی سمجھی اور نہ اس کے ممبر گنوارے میں گے۔ اس اندریش کی بھلی وجہی ہے کہ ملک میں رُکیوں کی بہتان ہے اور رُکی والوں کو یہ شکر کنوارے رُکوں کی تلاش ہوتی ہے اور گنوارے رُکوں کی تلاش خاص مشکل کام ہے۔ کیوں کہ گھر گھر جا کر تو ایک مالا یہ معلوم کرنے سے رہا کہ کس گھر میں کون رُک کا گزارا ہے — اب کنواروں کی انجمن قائم ہو جائے گی تو سارے رُکی والوں کو پہنچ چل جائے تھا کہ گنوارے رُک کے (مول سیں) میں کھاں دستیاب ہوتے ہیں — ہمیں یقین ہے کہ گنواروں کی انجمن کے قیام کا مقصد ایسا کوئی اشتہار نہیں ہے کہ شہر کے گنوارے لڑکے ہباں اکٹھے ہیں۔ آؤ اور داما دڑاٹی کرو" — لیکنی رُکی دلے فربو کھیں گے کہ گنواروں نے اپنی شادیوں کے لیے یہ ایک چال چلی ہے۔

جہاں تک پلات کا سوال ہے لگتا ہے ابراہیم جلیس کو اس کے لیے سوچنا نہیں پڑتا۔ اپنے اُس بارے والے واقعات کی اس طرح نہیں ادھیر دتے ہیں اور طنز کی بیچار کرتے ہیں کہ بے جان چیزوں میں بھی جان پیدا کر دیتے ہیں۔ کسی ورد فن کرنے کا مسئلہ ہے، جھوٹ بولنے کی بات ہے، دس روپے کا فوٹ ہے، اونچی ایڑی کی گریجوں ہے، اُنے داہی نسیہ ہے، اُنہوں کی بات ہے، عید ہے، بنارس کی ساری تکوناتیں، خلوات کدہ، بودھ دوائی، عہد کی شام ہے، لیکن کی تقسیم ہے، حتیٰ کہ ڈکار تک پر ابراہیم جلیس نے لکھا ہے، اور بھروسہ طور پر لکھا ہے:

ڈکار یک سماشی ادا نہ ہے، انسانی زندگی کا ایک لازمہ۔ انسان کی معاشی زندگی میں اس کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکت پھانپھ جب سے انسان نے اس کی اہمیت سے قطع نظر کیا ہے اپنی زندگی کو خدا پتے ہاتھوں کھن بنایا ہے اب انسان دو جہا عورتیں بھی دیتے ہیں۔

۱۔ پہیشہ ڈکار لئے ڈالے۔

۲۔ شادونا درڈ کار لینے والے۔

ہمیشہ ڈکار لینے والے انسانوں کو سماجی اصطلاحوں میں بولے آدمی: معاشی اصطلاحوں میں آسودہ حال آدمی، تجارتی اصطلاح میں سرمایہ دار اور امتیز امتیز اصطلاحوں میں بورڈھا کہتے ہیں۔ ان میں بادشاہ، وزیر، حکومت کے دوسرے عہدے دار، بینکر، کارخانے دار، زمین دار، سوداگر، طوائف اور جو رشائی ہیں۔

شادونا درڈ کار لینے والے انسانوں کا سماجی نام بھجوئے آدمی، معاشی نام بھجوکا، تجارتی نام مجلس اوقاف امتیز ای نام پر ورنہ ای ہے۔ اس قسم کے انسان سرکوں پر بھیک مانتے ہیں، دفتروں میں فاندوں پر بھجتے ہوئے۔ کالجوں سے نکل کر دفتروں کے چکر کاٹتے۔ سرکوں پر نکٹ ایسا بھجتے، بوسیدہ مکان میں کتابیں تعمیق کرتے، شرگنٹناتے، کھیتوں میں ہل جلاتے، کام جاؤں میں ہمہور سپرستے، ملے ملکے پر عصتیں بھجتے، اسٹیشن پر جانی کرتے نظر آئیں گے!"

ارددادیوں کی حالت نار کا ذکر کرتے ہوئے ابراہیم جلیس لکھتے ہیں:

"سال ہا سال تک شاعری کرنے اور زار و قطابر و نے سے تنک آگر میر جی نے اب اردداد کے دوسرے اصناف انسان لگاری، تاول نگاری اور پورتاژ نگاری شروع کی ہے۔ کیوں کہ شاعری کے مقابلے میں نثر کے زیادہ دام اٹھتے ہیں۔ میر جی نے دیکھتے ہی دیکھتے افسانوں، مضمون اور پورتاژ کی تقریباً ایک درج کتابیں تحریر کر دیں جس کی آمنی سے ایک ناشر نے کاڑھری دوسرے نے کوئی بخوبی تیسرے نے دوسری شادی کی لیکن میر جی جیسے کسی شادی مرگ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

ابراہیم جلیس زبان ہمیشہ عام ہم اور سادہ استعمال کرتے ہیں لیکن روانی اور دل کشی، شلگفتگی اور لطافت ان کے اسلوب بیان میں زور اور تاثیر پیدا کر دیتے ہیں!

"پرانے زمانے میں ایک مقولہ بہت مشہور تھا کہ صحت بڑی دوست ہے۔ لیکن جب نیازمند ایسا ہے اور اس نے پرانے زمانے کی ہر چیز کو اٹ پلٹ دیا تو یہ مقولہ بھی سر کے بل اگلیا چنانچہ اب وہ مقولہ یوں ہے —

دلت بڑی صحت ہے۔

میں آپ کے بارے میں تو کہہ نہیں سکتا البتہ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جس دن میری جیب خالی ہوتی ہے اس دن مجھے بختار ہو جاتا ہے۔ پنڈا پھنکنے لگتا ہے جسم قٹنے لگتا ہے۔ جو بھجوئے لگتا ہے۔ دل دھڑکنے لگتا ہے۔ طبیعت اتنی بڑھ جڑی ہو جاتی ہے کہ سانے کے والے ہر آدمی کا منہ فوج لیتے کوئی چاہتا ہے۔ اس دن سارا دن میں بستر پر بڑے بڑے کبھی جہاں ایاں لیتا ہوں تو کبھی سو جانا ہوں۔ لیکن جس دن جاندی کا ایک بھی سکتا یا کرنسی کا غذہ کا ایک بھی نکٹا ہوتا ہے، میں بڑا چاق و جوبند ہشائش بشاش اور گلکٹ نام سکرا تا رہتا ہوں۔ جماں یوں کی جگہ مسکرا ہیں اور بڑھ دیکھ کی جگہ تابندگی چہرہ پر کھیلی رہتی ہے۔ بخدا بالکل اسپورٹس میں لگتا ہوں۔"

غرض ابراہیم جلیس کی تحریریں نلات کے مٹے سے لیکر ملک دو قوم کی کہانی۔ ایک اور محبت، آسودگی اور آزادی سے لیکر سماج کی بہتری۔ ایک احاطہ کرتی ہیں اور طنز کے نثر چھوکر فاری کے ذہن کو بیدار کرتی ہیں۔

ایبراہیم جلیس

منفرد ادیب اور دوست

اُن گفت لوگوں کی طرح ابراہیم جلیس بھی زندگی کے کاروائے
خپڑے گئے، ان کی موت یک سانحہ ہے مگر اس سانحہ کی میثاق و تلقی
نہیں ہے کہ چند سفے کے بعد انھیں فراموش کر دیا جائے حالانکہ کہا یہی جائے
ہے کہ وقت ہر یاد کو بٹا دیتا ہے۔ یہ نظریہ کسی حد تک درست نہ ہے
جاسکتا ہے اس کی بنیاد یاد یہ ہے کہ مرنے والے شخص کی کسی جس
شدت سے محروم کی جاتی ہے وہ رفتہ رفتہ مختلف عوامل کی بدلت
کم ہونے لگتی ہے اور پھر وہ بھی بہت ہے کہ ہنگامہ کا رجہان ذہنیوں
پر غفتہ کا پردہ ڈال دیتی ہے مگر اس قسم کا روئیہ عام افراد کے سلسلے
میں درست بسایا جا سکتا ہے چونکہ ان کی راستکی اولاد اور خاندان
تک محدود ہوتی ہے اس نے بر عکس جن اشخاص کا تسلق دور تک کھاؤ
دیے ان کے بارے میں ایسا نہیں ہوتا اور پھر ایسے لوگ جو اپنے
تکمیلی عمل کے سہارے معاشرے میں پسندیدگی اور ناپسندیدگی سے گذرانے
ہوں جن کی کاوشیں کتابی شکل میں محفوظ ہوں آپ خود سوچئے وہ کہاں
فراموش کئے جاتے ہیں۔

تاریخ گواہ ہے جنہوں نے تھوڑا بہت بھی کام اس سطح پر سننے کر
کی جس میں ان کی توانا شناخت نظر آئے انھیں یاد رکھا جاتا ہے

یہ دوسری بات ہے کہ اس یادگار نے کے علاں میں آہ و زاری نہیں ہوتی بلکہ اس یاد سے جو داشتگی وجود ہیں اُنکی نئی معنی پیش نہیں ہے، مذہب نے بتایا ہے کہ موت زندگی کا خاتمہ بلکہ ایک نئی زندگی کا آغاز ہے۔ اس نئی زندگی پر تفصیلی گفتگو اس خفتر تحریر میں ممکن نہیں ہمارے سامنے تو مرنے والے کا تخلیقی کام باقی بتتا ہے اسی لئے اس کے حقیقی خدوں وال اُبھرتے ہیں، اس قسم کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ موت کے بعد ہی خوبیوں کو تماشہ کی گیا ہے۔ شاید آپ اس کو مردہ پرستی کی رسم کہہ دیں مگر یہ بُرا اُبزاد بُری ہونے کے باوجود عجی کسی قدر مثبت بھی جاسکتی ہے البتہ اتنا ہزف وہ ہے کہ بعض اوقات اس کے پس منظر میں زندہ افراد کی خواہشات ہوتی ہیں جن کی بدولت اس کا اثر دیر پانہیں رہتا۔

ابراهیم جلیس کو جو زندگی میں شہرت مالی ہرئی وہ آدمی کے آم کی طرح نہیں ہی، انہوں نے باشمور فرد کی طرح سرچاہو جب ان کی مدد پر کے سے مترد فیضت متصادم ہوئی تو ”جا لیں کر دو بُرا دی“ جیسی بُلھتا ب وجود میں آئی پر صغیر کی تقسیم سے قبل اس کتاب کی مسند یہ گی اس بات کی علامت ہے کہ اب راہیم جلیس کے احمد ایک توانا ادب پروردش پا جا کا تھا اس کھنے ۲۳۰۷ء کا ترقی سند تحریک کو بھی یاد رکھنا پڑے گا جس نے پر صغیر میں ادب اور شاعری کے لئے ایک نئی قفس پیدا کر دی تھی اس کتاب کی تکمیل اور اضافت نے اب راہیم جلیس کو ان ادیبوں کی صاف میں شامل کر دیا جس سے ادب فروغ نہیں ہے۔ اس کے بعد اب راہیم جلیس کی شہرت میں اضافہ ہوتا گیا اور ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ ان کے اخباری کام کی خاطر لوگوں نے اخبار خریدنا اور پڑھنا شروع کیا وافع ہے کہ اب راہیم جلیس کے اخباری کام کی پسندیدگی کے بازارے میں یہ تجویز ایسے ازاد کہ ہے جو ادب، صحافت اور دیگر مسائل پر گھری نظر نہیں رکھتے بلکہ کسی خاص جنبے اور پسندیدگی سے مختلف چیزوں کے گردیدہ ہو جاتے ہیں اور اسی حد تک سوچتے ہیں، اب راہیم جلیس کی مزید تحریریں پر گفتگو کرنے سے پہلے ایسے ایک نظر ان کے علاالت زندگی پرہیز ڈالنے پڑیں۔

اب راہیم جلیس ۱۹۲۳ء میں حیدر آباد کے فلٹ گلبرگ میں پیدا ہوئے، ان کے والد احمد علی حصیلہ اور تھے، انہوں نے اپنی تعلیم مقامی اسکول میں مالی ہے اسکول کی۔ ۱۹۳۲ء میں انہوں نے علیگढ مسلم یونیورسٹی سے گریجویشن کیا اس کے بعد ۱۹۴۵ء میں حیدر آباد کمیشن کار پرنسپل میں ملازم ہو گئے ۱۹۴۸ء میں سقوط حیدر آباد کے وقت وہ ریڈیو میں اسکپٹ رائٹر تھے۔ پر صغیر کی تقسیم ہوئی تو وہ ۱۹۵۰ء میں امروز لا ہوہ اور ۱۹۵۲ء میں امروز کراچی میں سب ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

۱۹۵۱ء میں چین جانے والے پہلے وفد میں وہ شامل تھے اس کے علاوہ بھی انہوں نے امریکہ، روس کا دورہ کیا، ۱۹۵۵ء میں روزنامہ ”جنگ“ کراچی میں ”دغیرہ وغیرہ“ کے عنوان سے کام لکھنے شروع کئے وہ کچھ عرصہ تک روزنامہ ”حوالہ“ کراچی کے مدیر رہے۔ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۷ء تک روزنامہ ”نجام کراچی“ میں ہوا تو دوبارہ ”جنگ“ میں ملازمت کر لی۔ ۱۹۷۰ء کی تک گیر صحافیوں کی ہرگز کام کے دوران ”جنگ“ سے الگ ہو گئے۔ اس کے بعد وہ روزنامہ ”حویت“ سے کام نکالی جیشیت سے نسلک ہو گئے۔ ۱۹۷۶ء میں ہفت روزہ ”حوالہ“ عدالت تھا ل۔ ۱۹۷۹ء میں روزنامہ ”مدادات“ کراچی کے ایڈیٹر ہوئے اور اسی اخبار کی ادارت کے دوران استقال ہوا۔

اب راہیم جلیس کی مشہور قصائیف میں ”ابلیس سے پہلے (ڈسار) کالا چور“، ”چور باداڑ“، ”لیارِ بیبی“، ”پاکستان کب بھائی“

"جیل کے دوں" جیل کی ساتیں "اوپر شیر واف اند پریشن" "زرد چہرے" "تنے تو پھنسے" دیگرہ شامل ہیں۔ ابراہیم نے بہت سی فلموں کی کی نیا اور مکالے بھی لئے۔ انھیں فلم "آچل" کی کیانی پر نگار ایارڈ بہم ادیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ابراہیم جلیس نے ریڈیو کے لئے بھی بہت کوئی کھا جس کے بارے میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ ان تحریروں میں وہ ایک مزانگار کی شخصیت سے ملتے آئے۔ ادب میں یہ میدان جس قساسان دکھائی دیتا ہے حقیقت میں اسی قدر مشکل ہے چونکا دیکھو گا کہ کام کا خدے ایک جنگ لڑنا پڑتا ہے اسی کا ایک وجہ تحریر ہے کہ مزانگار پریزوں کی علاحدی کرتے ہوئے ایسے بیٹو گا شکر کا ہے جس سے انسان میں ہنسی شکر فوج کر پھٹک دار سلو نے کہا تھا المیہ نگاری معاشرت میں کھیڑیں کا زدیہ ہے بلکہ طریقہ تحریر فروں کی ایسا نیت کہ فروٹ دینے ہے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں۔ لہذا اس کے مقابل کوئی تحریر کرنے کے لئے اس کے مقابل کوئی تعداد کو غلکین بناؤ جو اس کا موقع گئی ہے اسے ایک مزانگار کہا۔ تنہا آنسو بہارہ دوسروں کے سامنے مکرا تھے اور دوسروں سے بھی اس کی مکراست میں شامل ہو جاتے ہیں اور جب مکراست کا عمل بہت تو اناہر تر طنز بن جاتا ہے جس سے صحت منداشت مرتب ہوتے ہیں اُن طنز دمزاج کے بارے میں مشیہ احمد صدیقی نے کہا ہے کہ یہ بغل عالم کو مسح ہے جس میں عامل مفہوم اعصاب کا نہ ہو عمل اُسٹا ہو جاتا ہے۔

ابراہیم جلیس طنز و مزانگار کے میدان میں بہت بہمنام تھے انہوں نے صحافت سے ایک مضمون درستہ قائم کریا تھا، ان کی تحریروں میں تھا لیں کو روٹ بھکاری، جیسی چمک اور تفکر اس سے تھے تو نہیں بڑھا شاید اس کی وجہ سات وہ نامساعد حالات ہوں جن سے فیض احوالیں بھی گھبر گئے تھے اور اس سلطائیک اُتر آئے تھے کہ انھیں بھرب کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے اُنہوںیں ساختہ کاغذیں آگیا تھا۔ ابراہیم جلیس نے زندگی کو جس نادیے سے دیکھا اُسے معروفیت کا نام دے سکتے ہیں۔ زندگی کے بارے میں یہ نقطہ نظر کس قدر درست ہے اس پر اعتماد تو کیا جاسکتا ہے لیکن اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ ابراہیم جلیس کی تحریروں میں وہ چاٹنی تو نہیں دہ گئی تھی جو ان کے یہاں دکھائی دی تھی شاید زندگی سے صد جوئی میں انھیں یہ قربانی دینی پڑی۔

ابراہیم جلیس سے یہ ری طلاقات بھی نہیں ہوتی۔ انھیں قریب سے دیکھا ہے ان کا ردیلو سے آزاد مُنی اور ان کی ان گنت تحریریں پڑھی ہیں جن میں پسندیدگی اور ناپسندیدگی شامل ہے۔ آج ۲۹ اکتوبر ۷۷ کو ان کے انتقال کی خبر سن تو قریں محسوس ہو رہا ہے کہ کسی عزمیز ترین شخصیت سے خاصہ ہو گیا ہے۔ ابراہیم جلیس سے دا بستی اور تعلق کی بُخیاد پر میں نے ابتداء میں کہا ہے کہ اُن پسندیدگ فروں کی موت کے بعد بھی اسے زندہ رکھتی ہے اور زندگی کا یہ تعصیت اس نافی زندگی سے مخالف ہے۔ ابراہیم جلیس تو اب واپس نہیں آ سکتے لیکن ان کی تحریریں ہمارے درمیان موجود ہیں۔ آئیے ان تحریروں کے حوالے سے خود میں ابراہیم جلیس سے دا بستی کا باائزہ لیں ممکن ہے کہ ان میں نئی معجزیت ہے۔ اگر ایسا ہر اثر اس کا مطلب یہ ہے کہ ابراہیم جلیس ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

"جلیس کی موت سے صحافت کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ وہ اس دوسرے کے آخری کامیاب فکاہ نگار تھے۔"

— صدر لے پی این ایں میر غلیل الرحمن —

کل ہند اعزاز کے لائق

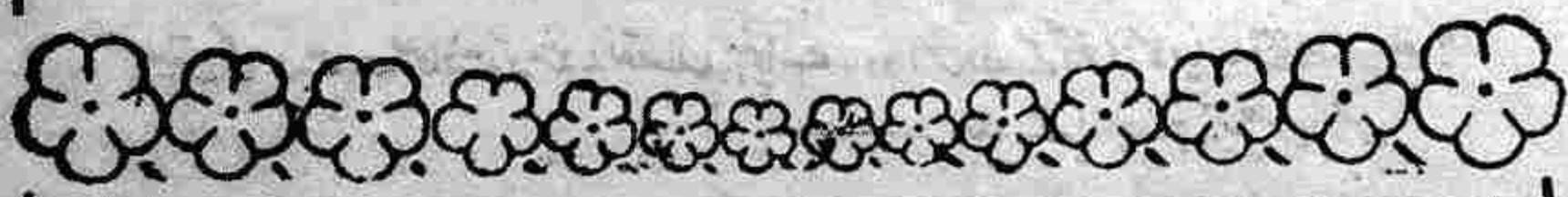
عام طور پر ہندستان کا غلط گودام کھلانے والی ریاست آنحضرات پرنسپالیٹ فائل نہ انہیں پیدا کرنے والی ریاست ہے۔ اس کا شمار ہندستان کی ان ریاستوں میں ہوتا ہے جو تیز ترین مختاری میں چاول پیدا کرتے ہیں۔

ہمارے یہاں چاول کی کثیر پیشہ ادارہ دینے والے تاجریوں کو کاشتکاروں میں مقبول بننے کی مستعدی کے حاکم سماں کی جگہ ہیں۔ ان سماں کے نتیجے میں کثیر پیداواری اقسام والے تاجریوں جیسے "جیا" "مدنا" "ستا" بھی تھے اور آپی ۱۹۳۳ء وغیرہ آج کاشتکار بارادیوں میں پہلے سے کہیں زیادہ مقبول و پسیدہ ہیں۔

سال ۱۹۷۷ء کے بعد ان میں زیگی پیداوار کو بڑھانے کے لئے متعدد تدبیر احتیار کی گئی ہیں۔ خدیف اور ریخ "دونوں موسموں میں کاشتکاروں کو فراہم کردہ اعانتوں کے علاوہ ۲۴۵ کروڑ روپے قلیل مدتی قرض کے طور پر تقسیم کئے گئے۔

ہماری ریاست نے ہبہ گیراہیت والے غذائی محاذ پر جو ممتاز اور نمایاں کامنے انجام دیتے ہیں وہ کل ہند اعزاز کے لائق ہیں۔

ناٹم محکمہ اطلاعات و تعلقات عام
آنحضرات پرنسپالیٹ - جیدا باد



جلسہ کی کہانی

جلسہ کی زبانی

نامہ کا لہان کی زندگی پر بعض اوقات ایسا بھرا اثر پڑتا ہے کہ زندگی پچ سچ اسم باسمی جو کہ رہ جاتی ہے۔ کبھی کبھی میں اپنے ہی نام پر غصہ کرتا ہوں کہ اگر میرا نام ”ابراهیم“ نہ ہوتا تو کیا میں ایک بُت شکن ادیب یا صحفی ہو سکتا تھا؟ اور میرے لئے میسوں کے مزود کی آگ اسی طرح بھڑکتی رہتی؟ یہ شاید مقدس نام ”ابراهیم“ ہی کا افسوس ہے کہ بالکل یہ غیر ارادوی اور غیر شعوری طور پر میرا جی چاہتا ہے کہ میرے سامنے جو بُت بھی نظر آئے اُسے تھڈ دوں اور جہاں بھی ظلم اور ننا انصافی کی آگ بھڑکتی نظر آئے اس میں کوڈ پڑوں۔

ہماری کالم نویسی کی ابتداء کس طرح ہوئی۔ ہماری کالم نویسی کا آغاز بھوکچھاتن ہی دلچسپ ہے۔ قیام پاکستان کے بعد جب ہم پر لشان حال مہما جریں کر لائیں ہیں اور روزنامہ ”امروز“ میں بحثیت سب ایڈیٹر ملازم ہوئے تو ایک دن ہمارے مدیر اعلیٰ اور نکاہی کالم نویسون کے شہنشاہ مولانا چراغ حسن حسرت نے ہماری تحریر سے خوش ہو کر اپنا وہ فاؤنڈیشن پن ایس انعام میں دیا جس سے وہ ”صرف حکایت“ کا مشہور فکاری کالم لکھا کرتے تھے۔

مولانا چراغ حسن حسرت کی موجودگی میں ہمارا لکھنا سیوئے ادب کے متادف تھا اس لئے ہم نے ان کے اس تحفہ کو مذکور اپنے سینے سے لگائے دکھا۔

میں ہمیشہ دل کے پاس چھپائے رکھا) اور پھر جب نلک کج رفتار نے مولانا حسرت کا سایہ ہمارے سر سے جھینی لیا اور جائے سارا دنیا ہو گئی تو ہم بھی فکاری کالم

نویسی کے میدان میں کرد پڑے۔

ہم نے سگریٹ نوشی کس طرح شروع کی؟

اپنی عمر کے ابتدائی ۲۰ سال تک ہم نے کبھی سگریٹ نہیں پی۔

ان دونوں ہم علی گڑھ یونیورسٹی میں بی لے کے آخری سال میں پڑھتے تھے۔ ہمارا ایک دوست ہم سے ہمارا ایک گرم گھٹ بیعنی "چیسر" عاریتاً ہم سے مانگ کر لے گیا۔ دوسرا دن وہ کوٹ واپس کر دیا تو اس کی ایک دیا مسلمانی کی ڈبی کوٹ کی جیب میں مل کر تھی۔

ہم نے سوچا کہ اس کی دیا مسلمانی کی ڈبی اسے واپس کر دی جائے لیکن پتہ چلا کہ وہ دوست یونیورسٹی سے تکال دیا گیا ہے۔ یہ سن کر ہم پریشان ہو گئے کہ اس دیا مسلمانی کی ڈبی کا ہم کیا کروں؟ ہم نے اس ڈبی کو اپنے دوست کی یادگار کے طریقے سے کہ میز پر رکھ دیا لیکن دیا مسلمانی کی وہ ڈبی اٹھتے بیٹھتے سوتے جاتے ہماری نگاہوں میں رکھنے لگی۔

گھریا وہ میز پر نہیں دھری تھی ہمارے اعصاب پر رکھی ہوئی تھی۔ ہم اُسے آٹھا کر باہر نہیں پھینک سکتے تھے کیونکہ ہمارے ایک عزم دوست کی ایک یادگار تھی لیکن جب وہ دیا مسلمانی کی ڈبی ہمارے اعصاب پر ناقابل برداشت ہو گئی تھیں نہ اپنے دوست کے مشورہ کیا کہ "ایک دیا مسلمانی کی ڈبی کا بہترین معرفت کیا ہو سکتا ہے؟"

چڑھا جانے سے کہ سگریٹ جلانے تک دوست نے دیا مسلمانی کی ڈبی کے متعدد معرفت بتائے لیکن ہمیں سگریٹ جلانے کا معرفت زیادہ دڑھنی فایدہ نظر آیا اور ہم نے فوراً گولڈنیک کی ایک ڈبی منگوائی اور دو دن اور آج کا عمل ہے ۵ چھٹی نہیں ہے مرنے سے یہ سگریٹ بھی ہوئی۔

ہمارے ملک میں دس کروڑ انسان رہتے ہیں لیکن یہ ان دس کروڑ انساف میں سے ایک بھی انسان ایسا ہے جو فدا کر گواہ کر سکے کہ "میں نے اپنی زندگی میں ایک بمحاجوٹ نہیں بولا۔" یہ موجودہ نسل ہے۔

اہد ایسا گروہ نہیں کہ تجھے آنے والی نسل کی طرف دیکھئے۔ منظر یہ ہے کہ —

باپ کھڑکی میں چھپا بھانک رہا ہے اور نخا بچھہ دروازے پر کھڑا علائیہ جھوٹ بول رہا ہے کہ "اباً گھر پر نہیں ہیں" یادو۔ فدا بنا تو کیا سہی بچھہ بڑا ہو کر جابر سلطان کے آجے کھڑ جن کہہ سکے گا؟؟؟

ہمارے لذکر کی زمانے میں ہر اسکول کے ساتھ کھیل کے میدان لازمی طور پر ہوتے تھے اور جو لٹکا کھیل میں حصہ نہ میتا تھا تو سب سو فرنی میں اس کی غیر ماضی ملک جاتی تھی۔ لیکن آج مل کے زمانے میں یاد لوگ دنئے "حکم تعلیم" کو خود کھیل بنار کہا ہے تو اسکوں کے ساتھ کھیل کے میدان کہاں ہوں؟

ہمارے آپ کے بغایے اسی لئے تھیوں میں کھیلنے پر مجبور ہیں، لیکن بے چارے تھیوں میں بھی پعدی طرح نہیں کھیل پاتے۔ یاد کرنی کھوڑی کسی موڑ گاؤں تھے آجا تاہے با یخیر کوئی راہ اگر زخمی ہو جاتا ہے اور نیچم یہ ہوتا ہے کہ کرک کے ٹلانہ پاکی افٹ بال اور کبڑی دفیرہ تک "ہار جیت کا فیصلہ ہوئے بغیر ختم ہو جاتے ہیں۔"

ابراہیم جلیس

نیا مرض

ابراہیم جلیس کی آخری تحریر جو
سادات کراچی کے اخri شاروں میں
شائع ہوئی

ڈاکٹر نے کیس ہستری سننے کے بعد آہ سرد بھر کر کہا
ہے "اماں۔ آپ کے بیٹے کو ایک نیا سیاسی مرض ہو گی
ہے۔ "رہو ڈیشا"۔
پھر اس نے اس بڑھی حرمت سے کہا
یہ مرض "رہو ڈیشا"۔ ایسا خطرناک مرض ہے جسما
کو دوسرا مرض "اسرائیل" ہر چند کہ یہ دونوں نام مسلم زندگی
جانی و تمن سامراج کے دو پیغمبر مکونوں کے بھی ہی مجموعی مرض
ہمارے پاکستان کے بھی عوام و فنمن باشندوں میں بڑی تیزی
سے پھیل رہا ہے۔
بڑھی حرمت نے دعائیہ لہجے میں کہ
"اللہ معاف کرے"

میں اُسی وقت اس بیٹے کو ہوش مگی تھا۔ اُس نے
مان کر ڈانٹا۔

کم از کم رہو ڈیشا میں کوئی مان ایسی دعائیں نہیں، اُنگ
سکتی۔ مان کو بڑا غصہ آیا۔ دھچکی کر بولی:
"ابے چپہ رہو ڈیشا کے پچھے"

ہمارے جتنے داؤں میں ایک شخص پہلے بار
مکسے باہر گیا بھی تو رہو ڈیشا آگیا۔ وہ پس پاکستان
آیا تو رہو ڈیشا بیسے اس کا عکیلہ حلام بن گیا۔
اُنھوں نے سنتے بدلنے پلٹنے پھر تھے کھاتے
پہنچتے بس رہو ڈیشا ہی رہو ڈیشا کا دنیا۔ بس
میں جگہ نہ ملی تو پھر سے بدلے:
"کمال ہے رہو ڈیشا میں تو بس میں
فرم بگد م جاتا ہے"

کھانا ہضم نہ ہو کئی ڈکاریں اُری ہوں تحریر
کا انہصار کرے:

"رہو ڈیشا میں تو کسی کو کھتی ڈکاریں نہیں آئیں"
بچارے کی ان پڑھ سادہ لوح مان اُسے ایک
باد عالم بے ہوشی میں ایک ڈاکٹر کے پاس لے گئی اعیانہ
"ڈاکٹر صاحب! ذرا میرے بیٹے کا تردید ہے۔
بلنے اسے کیا مرض ہو گیا ہے؟"

فیصلہ کن و مکمل عصر

لیکن اوجی کی تیزتر ترقی کے لئے شعبہ تعلیم کو فیصلہ کن اور کلیدی عصر کی صحت مالیہ ہے چنانچہ سال ۱۹۲۸ء کے بھٹ میں اس شعبہ کے لئے ۱۶۷۶ لاکھ روپیوں کی خطرہ رقمی گنجائش رکھی گئی ہے۔

ابتدائی تعلیم کا سون میں ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۹ء تک ہر سال داخلوں میں ۶ فیصد اضافہ کرنے کے لئے ایک خود میہم کے ذریعہ اہم اور پُرور مسامعی کی گئی۔ یہ بھی تجویز ہے کہ ۱۹۳۰ء میں اسکول قائم کئے جائیں۔

ابتدائی کلاسوں میں داخلوں میں اضافہ کرنے کے لئے اور تک تعلیم کو روکنے کے لئے دوسرے کھلنے کے پروگرام کے علاوہ درسی کتابوں کی امداد۔ حاضری مطالعہ اور یونیفارمس کی فراہمی جیسی ترغیبات بھی مہماں کی بارہی ہیں۔

ناٹم ملکم اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آذھرا پر دیش جید آباد

DPR No. 3/78-79



• ابراہیم جلیس •

فلہمی زندگی اور چننا جو رگرم

مجھے اس آب دگن کا دنیا، سیاسی دنیا، ادبی دنیا اور علمی دنیے سے زیادہ فلمی دنیا بہت پسند ہے۔ اگر پہلے مجھے اداکار بننے کا بھی بھی شوق پیدا نہیں ہوا میرا (جی) چاہتا تھا اور اب بھی چاہتا ہے (آخر جی ہی تھہرا کچھ دکھ جائے گا انہوں نے) کہ میں کم از کم فلمی انڈنگ کار کی حیثیت سے اس روزگار کی دنیا میں پہنچا نام پیدا کر دیں۔

چنانچہ خاص بڑی عمر میں یعنی تقریباً بائیس سال کی تاریخ میں ایک دن میں گورے سے فرار ہو گیا۔ اون دنوں بمبئی کو "بھٹکوڑوں کی جنت" کہا جاتا تھا، بمبئی میں میرا ایک شاعر دست ساحر لدھیانوی رہتا تھا۔ جو ان دنوں فلمی شاعر بننے کی وجہ میں، شعر لکھنے سے زیادہ ہتھ پاؤں مار دیا تھا، دکٹوریہ ٹرینیس عرف بوری بندرا سٹیشن سے میں اسکے پاس پہنچا تاکہ سرچھاپنے کو نہ کہی کم از کم اپنا صوت کیس اور بستر رکھنے کی جگہ ملن جائے۔

ساحر لدھیانوی نے مجھے علمی دنیے سے بدلی فلمی دنیا میں آنے پر مبارکباد دی اور مجھے ہر تھے چنے پیش کئے کہ اس کی عادت پہلے دن سے ہی ڈالنی پا ہے کیونکہ ہندوستانی فلمی صفت اور خود بریاں لمحنی بھجنے ہوئے چنے چزوں کا ایک دوسرا سے بد اگر اعلیٰ ہوتا ہے۔ میں نے بھرنے ہوئے چنے کھاتے ہوئے پوچھا:

"فلمی دنیا میں نام پیدا کرنے کے لئے مجھے کیا کیا کرنا پڑے گا؟"

ساحر لدھیانوی نے بھجنے جتنا مختصر جواب دیا۔

"کچھ نہیں۔ چنے چانا پڑے گا۔ پہلے پہلے بھونے ہوئے چنے، بعد میں تو ہے کے چنے"

چنے کھانے کی عادت ڈالو، یہ فلمی دنیا کی مخصوص غذا ہے، آج فلمی دنیا کے بھنے بھی باقاعدہ

فلہمی
زندگی

میں
میرا

پہلا
پڑھا

اور
تلخ

تجربہ

سائنس بن کر جک رہے ہیں وہ بپھلے چنے کے دلنے تھے
میں بھرا گی اور بولا:
گھر یہ بات ہے تو میں نسلی دنیا سے پھر علمی دنیا میں روت جاؤں گا،

"چنے کھانے کی عادت ڈالو، یہ فلمی دنیا کی مخصوص غذا ہے اُن فلمی دنیا کے جتنے بھی باشندے تاریخ کو جک رہے ہیں وہ بپھلے چنے کے دلنے تھے"

ساحر لدھیانی ہنسا اور بولا:

"بس ابھی سچے بھرا گئے صرف چنوں سے ڈر گئے، اور ہے میاں تو لو ہے کے چنے چبانے پڑیں گے۔ ہمت سے کام و میں بھی تو تمہارے ساتھ ہوں۔"

ساحر لدھیانی کی رفتار کے تصور نے ہمت بندھائی اور سختی بھر چنے منہ میں ڈال گھوڑے کی طرح ہنہنا کر ہنسا اور بولا: "جھا، ہر چہ بادا بار۔" میں چنے کھانے کے لئے تیار ہوں اور لو ہے کے چنے چبانے سے بھی ہنہنا جکھا دل گا ساحر لدھیانی نے میری پیٹھ پھٹکوں کی اور ہم بس میں سوار ہو گہر دادر پھوپھے، دادر ایک اعتماد سے غبیبی بلکہ چتران کی فلمی دنیا کا مرکز ہے دہاں آپ کو پانچ چھ اسٹو ڈیز میلے شا۔، فلم لکھنؤں کے دفتر ان گنت اگر ایکریں اور لائف دلتے نظر آئیں گے۔ ساحر لدھیانی، میرا دہاں کی ایک مشہور فلم کسپنی تک مشہور فلم ساز سے تعارف کر انا چاہتا تھا مجھ پر اس مشہور فلم کسپنی اور مشہور فلم ساز دونوں کا بڑا فائماں رہب تھا، میں جی ہمیں بڑا خوش ہوا کہ اگر اس مشہور فلم ساز سے میرا تعارف ہو گیا اور اس مشہور فلم کسپنی میں مجھے کام مل گیا تو پھر ترقی کئے مجھے زیادہ روڑ دھوپ نہیں کرن پڑے گی، میں پر صورج رہا تھا کہ اس مشہور فلم کسپنی کا کوئی اتنا بڑا دفتر ہو گا جتنا کس بادشاہ کا محل ہوتا ہے لیکن ایک لاذہ ہی اور ایک ایرانی ہوشی کے درمیان ایک تنگ سے زینے کے پس پہنچ کر ساتھ نے کہا:

"لو اب تیار ہو جاؤ، کہیں اس مشہور فلم کسپنی اور مشہور فلم ساز سے مرہوب نہ ہو جانا بلکہ ہر ممکن طریقے سے اپنی رہوب کرنے کی گوشش کرنا۔"

ہم نے نکلائی کی گئی ڈسیلی کی۔ سر کے جھے ہوئے باری کو ہاتھ سے بگاؤ کر بے ترتیب کر دیا اس طرح کہ بڑا بے نیاز قسم کا اوپنے نظر آؤں جو اسی عالم بے نیاز کی سے مکمل از بیتھ کے مانعے بھی چلا جائے، پہنچنے کیا حقیقت رکھا ہے؟

زینے لئے کہ کہم ایک تنگ سے کمرے میں داخل ہونے جس میں دو میزیں اکٹے ملئے رکھی ہوئی تھیں جملے کے ایک طرف ایک بھائی بھر کم سیاہ نام چیپک نہ آدمی سیاہ رنگ کے گیبر ڈین کا پک پتلک اصلی سعید قمیض پہنچا تھا۔ سامنے دو فالوں قسم کے آدمی نیچھے تھے اور دیوار کے صاف ایک صوفہ پر تینا نوجوان لڑکیاں دلبے تھاں پاؤ دلبر قی قھوپے اور اپ اسکے چھٹے بیٹھی اور تھیں، عیندوں رہیاں خوب صورت کیم اور خوب جسم نیارہ تھیں، ہاسہ مغل ہو سئے ہی بھائی بھر کم سیاہ نام چیپک نہ آدمی آٹھ کھڑا بجا اور بولا:

اُد بھی اپنا شاہزادے اُتم ساہ بڑے فلم کے بعد دھرمیں آیا ہے ۔
ساتھوں سکر اخچہٹے بڑے نیاز مندانہ انداز میں اس سے ہاتھ لایا۔

میں بڑا عیران ہوا کہ اس بد تیز آدمی کے ساتھ کو سالا کر دیا۔ اور ساتھ ہے کہ اس طرح نیاز مندانہ انداز میں سکاتے ہوئے
اٹھ جا کر قلوص کا منتظر ہو گوئا ہے، ایک اس وقت ساتھ نے کہا،

”بیٹھو جی، میں آپ کو آرڈر کے ایک بہت بڑے ادیب سے ملنے لایا ہوں، ان سے ملتے ہے: یہ سڑا براہیم جلیس مرحومہ دُور
کے چوٹی کے ادیب؟“

سینئھ میری طرف ریختے ہوئے بولتا ہے:
”اُمُّ س د آیا،“ ابھی سالا ہم تو سے مل کر بہت خوش ہوا۔ سینئھ نے معاون کے لئے ہاتھ بُٹھایا لیکن یہ سالا؟
میں نے طرکاً و کہاً ہاتھ ملا لیا اور پھر ہم سب بیٹھ گئے۔ سینئھ نے کچھ میری طرف اور کچھ ساتھ کی طرف ریختے ہو شے پوچھا،
”اب آپ لوگ کیا لیں گا، سوڑا لیں گا یا پائے لیں گا؟“ ساتھ نے کہ دیا:
”پائے لیں گا سینئھ“

سینئھ نے فرکہ کر آؤاد دی

”ارے لام مر اٹھے! باہر دالے کو سات پونے بول“

میں دل میں سوچنے لگا کہ کیا یہ دہی شہر دنل ساز ہے جس نے وہ پانچ ہندوستان گیر شہر رکھنے والی فلمیں بنائی ہیں
جن کے نام میں یاں مصلحت نہیں بتا سکتا! یا پھر ساتھ لکھا گیا میرے ساتھ مذاق کرہے ہیں، یہ سیٹھ بلکہ یہ سیٹھ سالا ایسی پیشہ
مالکت میں یہاں بیٹھا ہے۔ کپڑے میلے، دکر دل پر مشتمل فلم کمپنی کا دفتر اور دام مر اٹھے اور باہر فالا اور تینی خوب جسم ہو رہیں
کیا یہی ہے فلمی دنیا؟ — میں تو کیا کیا تصدیقات لے کے آیا تھا، سوچا رہتا تھا کہ فلمی دنیا اس علمی دنیا سے کتنی مختلف
اوکھتی شاندار ہو گی! لیکن قریب کرنے پر یہ کتنی بھیاک نظر آہری ہے ایں دہی سوچ رہا تھا کہ سینئھ نے اپنی جیب سے بھونے
ہوئے چھٹے نکال کر میرز پر پکھیر دیئے اور بولا:

”رہی مٹی جی — پائے آنے تک ذرا مہر جلا دا“

پھر جھونے ہوئے چھتے جاتے ہوئے سینئھ نے ساتھ سے لے رہا: ”ابھی آپ نے وہ ہمارا گیت لکھ لیا ہے تو فرناؤ نا“
گیت کی سچویں یہ تھی کہ ہیر دہی کی غلط فہمی کا شکار ہو کر ایک دسرے سے رد ٹھے ہوئے ہیں لیکن ہیر دہی
کی ہمراز سہی اس غلط فہمی سے واقف ہے اور وہ بذریعہ گیت دونوں کی غلط فہمی درکرنا چاہتی ہے، ساتھ نے ایک میرزا ن
نیک قسم کا گیت سنایا لیکن سینئھ نے پسند نہیں کیا اور بولا:

”اپنا شاعر سائب! اس کو تم ذرا مجید اور مزیدار بناؤ۔ اس گیت میں خودت کا جو بن ہونا چاہیئے ہم اس میں پچھلی
لگ اڑنا ملتا ہے۔ ذرا پر کہا بات صحی منگتا ہے؟“

ساتھ نے منحرے پر سے جواب دیا:

”سیٹھ تو نکرنا کر د۔ ہم اس میں عورت کا جوں بھی ٹڑا مجیدا دکھنے گا اور ہر صرخ میں دفعہ بھی لوگ اٹائے گا اندھا۔“
گیت میں پریم ترکٹ کوٹ کر بھر بھر گا۔ اچھا۔ اب اُدوانس ایک پانچ سو روپیہ تو دلا ددھ۔ ہمام روست آیا ہے ہم اس کو
بھی کی سیر کرانا منگتا ہے اور ہم تم کو اس سے بھی ایک زور دار اسٹوری لکھا دے گا۔“
سیٹھ نے پتوں کی جیب میں پتھر ڈالا اور میں حیران رہ گیا کہ یہ میلی پتوں، ہزاروں لاکھ اُبھی پتلوں سے زیادہ قسمی تھیں کیونکہ
ایک تھی میں اس پتوں سے کوئی دو تین ہزار روپیہ نہیں آیا اور اس میں سے پانچ سو روپیہ بغیر کسی رسید کے سیٹھ نے سارے کو دی دیا
اور بولا:

”ہاں جو رائٹر۔۔۔ آپ کے ائمہ میں کوئی فس کلاس اسٹوری کا آئیڈیا وائیڈیا ہوئیا تو ہم کو پہلے رکھا دو قریم تم
سے کا نظر کیت کر دینگا۔“

اس کے بعد ہم باہر نکلے۔۔۔ میں نے ساتھ سے پوچھا

”یار سارہ عجیب آدمی ہے یہ۔۔۔ اس کی جیب میں اتنا بہت سارہ پیسہ ہے اور یہ آتنا نہ ہو اُرمیا ہے لیکن بھر بھی
چھنے کھاتا ہے۔۔۔“

ساتھ نے کہا: ”یار تم ہنس جانتے اب سے سو سال پہلے جب یہ میں کچن کے عشق میں بمتلا گھر سے بھاگ کر بھی آیا
تھا تو اس وقت اس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا اور وہ بھی کی سڑکوں پر دن دن بھر چھنے کھا کر گھومنا کرتا تھا۔۔۔ اب لکھتی
ہے لیکن اس زمانہ میں بھی وہ چزوں کو نہیں جھوٹا جاہلک پھر ساخترنے بھجے ایک اور فلم پر دیو سر کا قصہ سنایا جو مغلیسی سے تھوڑی
تک چھنے کھاتا رہا۔۔۔ لیکن دولت مذہب نے کے بعد وہ ان چزوں کو بھول گیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج جگہ اس کی ساری فلمیں فیصل
ہو گئی ہیں اور اُسے کہیں کام نہیں ملتا، آج وہ دادر کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا ہے حتیٰ کہ اس کی جیب میں چھنے کھلنے تک
کے لئے پئیے نہیں ہیں۔۔۔“

اس کے بعد میں دانہ نخود بریاں پر ایمان لے آیا اور فلمی کہانی لکھنے میں صرف ہو گیا اور اس کے بعد دو سال سکیں
نے مسلسل چھ سات فلمی کہانیاں لکھیں لیکن ایک فلمی کہانی بھی نہ پسند کی گئی اور نہ فروخت ہو سکی، ناچار مجھے تینوں وقت چھنے کھا
کر اپنا پیٹ بھرنا پڑا۔۔۔ ایک دن تنگ آکر میں نے فلمی دنیا سے متعلق ایک فلمی کہانی لکھی جس کا نام تھا ”چنا جد گرم“
اس میں صرف یہ بتایا گیا تھا کہ فلم ساز، فلم ڈائرکٹر، ہیرد، ہیرد، ویلن اور کامیڈیں پھر اسٹوری رائٹر، شاعر وغیرہ کس طرح
چھنے کھاتے ہیں، کیوں کھاتے ہیں؟ ایک دانہ بریاں پر ہیرد، ہیرد کی طرف کس طرح رافب ہوتی ہے اور ایک دانہ سرپر
کی خاطر ویلن اور کامیڈیں کو کیا حرکات ناہنجار کرنے پڑتی ہیں جب میں نے یہ فلمی کہانی ایک پر دیو سر، ایک ڈائرکٹر، ایک
ہیرد اور ایک ہیرد، ایک ویلن اور ایک کامیڈیں کی موجودگی میں سنا تو سب کے سب چڑک اٹھے ہم منہ مانگے دامون، وہ
فلمی کہانی خوبی لی۔۔۔ اس کے بعد جب پر دیو سر نے مجھ سے اسکا قسم کی ”بے دار“ کہانی لکھنے کی دعوت دی اور اُدوانس قریم بھی
دنیا چاہا تو میں نے آنکھوں میں آنسو لا کر ہاتھ جوڑ کر ان سے کہا:

”اب تو میں اسیدھا اپنے دہن جاؤں گا۔۔۔ اپنے معدے کا علاج کر اؤں گا۔۔۔ اندھہ بھر سے میرا معدہ چھنے کھلنے کے

قابل ہر قٹے ۴ تو پھر میں بیٹھ کا مرغ کر دیں گا — اب تو کان پچھڑا ہوں۔

اس کے درستے ہی روندہ میں اپنا جو ریہ بستر سمیٹ جیدا باد دکن بھاگ گیا۔ اور گھر پہنچ کر اپنی داد دہ کے قدموں میں

بلیخ پانچھڑا روپے اور مٹھی بھر جنے رکھ کر بولا :

”ماں! فلم دنیلے سے میں یہ دناد تجھے تیرے لئے لایا ہوں،

میری ماں نے چھنے پھانک کر روپے گلنے شروع کر دیئے۔

بات پڑانی ہو گئی ہے یہ کہ اب جب کبھی میں کسی خوش پوش آدمی کو سرہک پر سے چھنے کھاتا ہو اگر تا دیکھتا ہوں تو فوڑا
سمجھ جاتا ہوں کہ یہ ضرور فلمی دنیا کا آدمی ہے آپ کو بھی جب کوئی خوش پوش شخص سرہک پر سے چھنے کھاتا ہو اگر تا انظر
آنے تو آپ بغیر کسی جسمک کے روک کر اس سے پر چھنے کہ آپ کس فلم میں کام کر رہے ہیں تو وہ آپ کو بغیر کسی تکلف
کے اس فلم کا نام بتا دے گا وہ تجربہ توجہ ہو گا — فی الحال یجھے چھنے کھائیے اماں یا رہ ۵
بے دیکھ کر دیکھ کر چھنے ہم نے کھائیں گے کچھ کہاں یا رہ اب اے ہوئے تو ہیں

مطبوعاتِ زندہ دلائل حیدر آباد و دیگر مژاہیہ کتب

جستہ: شگفتہ

۳/۵.	مجموعہ کلام	مصطفیٰ رضا نقوی داہی	نشر د مرہم	
۴/۵.	معفایں	بھارت چند کھنڈ	تیرنیم کش	
۳/۵.	"	رشید قریشی	مزاح شریف	
۶-	"	پہ دینہ یہ اللہ مہدی	پھیر چھاڑ	
۶/-	"	یوسف ناظم	سائے احمد ہمسائے (رغلے)	
۲/-	مجموعہ کلام	برق آشیانوی	محمد ارشاد	
۵/-	معفایں	خواجہ عبد الغفور	لالہ زادہ	
۳/۵.	"	مجتبیٰ حسین	قطع کلام	
۴/-	"	مجتبیٰ حسین	بہرحال	
۶/-	"	مجتبیٰ حسین	قصہ مختصر	
۶/-	"	خواجہ عبد الغفور	گھنی و گلزار	
۶/-	"	سیح الجنم	دہ پرده	
۶/-	"	یوسف ناظم	فقط	
۸/-	"	بھارت چند کھنڈ	کیا تام نہ ہو گا	

ابراهیم جلیس

فلٹ میں

بالکل صیحہ دلت تو باتی ناممکن ہے کہ اب سے کتنے برس بعد ایسا ہو گا — البتہ انہماز آئیہ ضرور کو چاہا سکتا ہے کہ آئندہ چالیس برس کے اندر پاکستان میں عورتوں کے بر قعے، غرارے، زنا فی شلواریں اور ٹھینیاں — مردوں کی شرعی دار ٹھینیاں، ترکی، روپی یا بجا ج ٹھینیاں، پکڑ ٹھینیاں اور شیر و انسیاں اسی طرح بالکل نظرناہیں گی جس طرح آج کل کمپونسٹ چین میں امریکی پاشندے اور امریکی میں کمپونسٹ چینی پاشندے بالکل نظر نہیں آتے۔

اردو زبان بھی پاکستانی سے ایسی ہی غائب ہو جائے گی جیسی کہ چین سے انگریزی زبان غائب ہو گئی ہے۔

جب تک کوئی عورت اپنی زبان سے یہ نہیں کہے گی کہ "میں پاکستانی ہوں۔"

اور جب تک کوئی مرد اپنی زبان سے یہ اعتراف نہیں کرے سکا کہ "بحداللہ میں مسلمان ہوں۔"

اس وقت تک پاکستان میں "پاکستانی اور مسلمان" کو پہچاننا اتنا ہی مشکل ہو جائے گا جتنا کہ غریب سے ایک دم امیر ہو جانے کے بعد اپنے غریب چھا، ماموں بلکہ ماں باپ کو تک پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔

دوسری چنگ عظیم تک انگریزوں کے بارے میں کہا جانا تھا کہ "دنیا میں انگریزہ واحد قوم ہے جس کی حکومت کا سورج بھی غروب نہیں ہوتا۔"

اب انگریزوں کی حکومت کا سورج صرف اپنے ہی ملک میں غروب د طور ہوتا ہے لیکن انگریز اب بھی خر کر سکتے ہیں کہ

"انگریزی تہذیب اور انگریزی زبان کا سورج دنیا میں اب بھی کہیں غروب نہیں ہوتا۔"

اب انگریزوں کی حکومت اپنے جزو تک محدود ہے لیکن انگریزوں کی تہذیب اور انگریزی زبان کی دنیا کے چھپے پر اب بھی حکومت ہے۔

انگریز نے گلے میں نکٹائی باندھنا اور کوٹ پستلوں یہ تھا دنیا کے ہر ملک کے پاشندے کو اور خاص طور پر پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کو سکھا دیا۔

انگریز نے ڈھانی سوریس ہندوستان پر حکومت کی لیکن کسی انگریز مرد نے ان ڈھانی سوریوں میں تنقید بھی شیر و انسی پہنچی اور تم کسی انگریز عورت نے سازھی چھلی پہنچی۔

ڈھانی سوریوں میں ہندوستانی پاشندے تو فرق انگریزوں کی طرح انگریزی بولنے لگے۔ لیکن انگریزوں نے بھی طرح اردو سمجھنے اور بولنے کے باوجود اردو زبان میں بات نہیں کی۔

اگلاس نے بھی اسدریں بات بھی کی تو اس طرح کی کہ سچا مشکل ہو جاتا تھا کہ کجت اندو بول رہا ہے یا انگریزی ہے مثلاً کوئی انگریز ہے کہتا۔

"دیر و ازے پین کر"

"چوندازے کول ڈے"

"تو ہندوستانی یہ سمجھتے کہ وہ یہ کہہ رہا ہے کہ"

"در فازہ جنڈ کر"

"در فازہ کھول دے"

لیکن اس کی لیڈی یہ سمجھتی جیسے وہ یہ کہہ رہا ہے

THERE WAS A BANKER

THERE WAS A COLD DAY

آج کل کوئی خیر ملکی شخص جب نقصے میں پاکستان کے ملک کو دیکھا ہے یا اخباروں میں پاکستان کا نام پڑھا ہے اور ہر کیل بار پاکستان آتے ہے تو بستر سے جائے کے بعد بھی اسے لپٹنے بازو میں چلکی بھر کر تھیں کرنا پڑتا ہے کہ وہ جاگ رہا ہے اور پھر وہ جیساں ہو جاتا ہے کہ

"کیا میں لندن میں ہوں یا کراچی میں؟"

جس ہوٹل میں وہ ٹھیکرا رہا ہے اس کا نام انگریزی ہے جس سرکل پر سے گزر رہا ہے اس کا نام افسوسن اسٹریٹ یا دکنودیہ روڈ ہے۔ جن آدمیوں سے وہ ملتا ہے وہ اس کی طرح گلے میں نکٹائی پاندھتے ہیں کوٹ پستلوں پہنچتے ہیں اسکی کی طرح ففر انگریزی بول رہے ہیں۔ جو کھانے وہ کھاتا ہے وہ وہی ہے جو لندن میں کھاتا رہا ہے صرف ہمارے چہرے کا کالا یا سانغلارنگ ایسا ہے جس سے وہ اپنے آپ کو ڈھارس دیتا ہے کہ

غہیں — میں لندن میں نہیں

میں تو کراچی میں ہوں۔"

رنگ کے علاوہ صرف ہماری عحدتوں کا لباس ایسا تھا جس سے ایک خیر ملکی کو یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ لندن میں نہیں کراچی میں ہے۔

یہیں پر سفل شام کراچی کے ایک بہت بڑے فہیش ایبل ہوٹل کی ایک دعوت میں ایک بڑی سرخ سفید انسٹی آنکھوں والی ایک نوجوان لڑکا بہت بسند کافی اس نے سیاہ رنگ کا اسکرٹ پہناتھا، اس کی پہنڈیاں بڑی سٹوپل تھیں۔ اس کے ہاتھ میں درسلکی کا گلاس تھا۔ انگلیوں میں سگریٹ جل رہی تھی اور وہ مخصوص امریکی لہجے میں انگریزی بول رہی تھی۔

وہ لڑکی اتنی خوب صورت تھی کہ اگر بھی اور امریکہ کے سارے ہائیڈروجن بم اس دنیا کے سارے انسانوں کو ہلاک کر دیں اور صرف یہ لڑکی دنیا میں باتی وہ چلتے تو وہ دنیا بھر بھی آباد رہے گی۔

اسی لیے اس سے تعارف کو جی چاہا اور تعارف کے حصان میں نے اس سے پوچھا۔

"وچ کنڑی و بیلانگ؟"
وہ کندھے اچکا کر دیو۔

"پیکش" — (پاکستان)
میں نے چرت سے پوچھا
"آریوا یگھو پاکستانی؟"
اس نے بتایا "ذ — اے محمد بن"
میں نے اور زیادہ حیران ہو کر پوچھا۔
یور نیم —?
ہونٹ سیکر کر دیو۔
"فیٹی ما" — (فارس)

دو سو سال پہلے کی فاطمہ جو محلہ را کی سات دیواروں میں چشم فلک سے بھی چھپی رہتی تھی۔ جو بعد میں بر قعہ اور حکم
سے باہر نکلا کرتی تھی اور بعد میں جس نے بر قعہ بھی آتا رکر چھٹنک دیا۔ بعد وہ نیم عمر یاں بلاس پہن کر باناروں میں
گھوٹتی رہی۔ دہی فاطمہ اب اسکت پہنئے لگی ہے اور اب "فاطمہ" سے بلکہ "فیٹی ما" ہو گئی ہے۔

کچھ کل پاکستان میں بعض پڑتے دیوانے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ
"پاکستان سیٹو نیٹور سے بکل ہائے"
"پاکستان کامن دلیتھ کو بھپور دے"
پاکستان کا سیٹو اور سخیو یا کام دلیتھ میں رہنا اتنا خطرناک نہیں جتنا کہ
"ابراہم جولیس اور فیٹی ما"

کہ پاکستان میں رہنا خطرناک ہے
پاکستان صحیح معنی میں پاکستان اسی وقت بن سکتا ہے جبکہ — ابراہم جولیس اور فیٹی ما — پاکستان سے
ہیشہ کیلے چلے جائیں اور — ابراہم اور فاطمہ — پاکستان واپس آجائیں
دی ابراہیم جس کے بارے میں علامہ اقبال نے پیش کی گئی کی تھی کہ
اوہ دہی فاطمہ جس کو حکیم الامت نے یوں خراج عقیدت پیش کیا تھا کہ
فاطمہ تو اپر دے امت مروم ہے

شہروں میں رہنے والے غریب ہے تو زب باشندے
کی بھی تو نہ تھی ہوتی ہے کیونکہ شہروں میں
غریب باشندوں کے لئے بس اور شام جیسی
ستی سواریاں پلاٹی جاتی ہیں مثلاً میڈل
فیر محکوم صرف پالیس قدم دوڑ جانا ہوتا
بھی اور اپنے ساتھی کو آواز دیتے ہیں۔

”آؤ بھی غریب فاں۔ وہ دیکھوڑا م
آرہا ہے۔“

اور بھائی غریب فاں اپنی ملک جلیس
تو نہ پر سے پھسلتے پا جائے کو سنبھالتے
فیر محکوم کے چھپے ٹرام پر چڑھ جاتے ہیں۔

تو نہ کو بیماریوں کی گھری بھی کہا جاتا
ہے۔

تو نہ بخلتی ہے تو پھر طرح طرع کی بیالی
بھی پیدا ہونے لگتی ہیں۔ بد ہضمی، فائر
خلن، چیسرک، ٹبل اور بلڈ پریشرد فیر تو نہ
ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔

جسی لوگوں کی تو نہیں ہیں وہ اس کا
اعتراف کریں گے اور جن لوگوں کی تو نہیں
نہیں ہیں وہ تو نہ والوں سے پچھلیں یا
پھر اس وقت تک انتظار فرمائیں جب تک
کہ ان کی اپنی تو نہ تکل آئے۔

تو نہ کا توڑ پیدل چلانا ہے اور دنیا کے
سارے حکیم اور داکٹر، اس رائے پر مستفق ہیں
کہ چیل چلتے والے کی تو نہ نہیں ہوتی ہیں
پیدل چلانا صحت کے لئے بہت مفید ہے۔

محوجو دہ دنیا کی شہری زندگی میں
”قتل سے پیدل“ روگ توبے شاہر ہیں لیکن
شکر پر پیدل چلتے دلکہ بہت کم —
یہاں وجہ ہے کہ شہروں کے سارے باشندے
”تو نہیں“ ہوتے ہیں۔

پرانے زمانے میں صرف بادشاہوں،
نوادر، جاگیر داروں، رئیسوں اور دوستوں

مندوں کی تو نہیں ہوا کرتی تھیں کیونکہ دہ
دن بھر بیٹھے رہتے تھے اور اگر ملٹے
بھی تھے تو بیٹھ کر چلتے تھے۔ ویسی ہاتھی
کی عذری، اوت کے کجاوے، رنچ، پانچ
فٹی دفترہ میں بیٹھے ہیں اور پلے جا رہے
ہیں۔

اس طرح ہمیشہ بیٹھے رہنے کے بھث
ان کا تو نہیں نکل آتی ہیں اور تو نہ گویا
زنگوں کی نشانی بھی جاتی تھی۔

مگر جب سے ہولی جہاں، ریل، بس
ٹرام، موٹر سائیکل، اسکوٹ، رکٹھ، ہائی
وکٹھیا اور سائیکل مام ہوئے ہیں۔
تو نہ تو نہیں کی نشانی نہیں رہی۔ البتہ اب
تو نہ شہری زندگی کی نشانی بن گئی ہے۔

ابراہیم جلیس

پیدل

چلتے

پالے

پس

خواتین جن کی صرف نہ زبان پہلتی ہے

مورتوں کے کار چلانے پر ہیں تو
جیسے آئیں۔ ایسے دوستات کے بارے میں شعر "مرحوم
کوئی افڑھ نہیں ہاں البتہ شہر کے محکمہ
قریبے کے تھے۔
جس کو مرت آئیں ہے سخت کے آزار سے
دب کے مرتا کہے وہ یہاں کی کوئی کار سے
کہہ سکتے۔ کیونکہ مرتکوں پر جتنے کھبے لگ جائیں

ہمارے لکھ میں مرتوں کی زبان شاید
اس نے زیادہ چلتی ہے کہ عمد میں خدنے والوں نہیں
چلتیں پرستکے روپیں جس کے باعث یہ پیدا کی جو قیمتیں
وہ بھرگھر میں بیٹھی رہنے پر مجبور ہیں وہ پختا
ہیں تو سوتے کے کر سے باہر چیز فرنے، باہر پہنچنے
خشی خندنے یا غسل فلنے سے ایک اور غلنے تک مبتلا
ہیں یا اگر بہت ہوا تو انھوں نے پنڈ جواری سے بس
پیدا ہیو کہ بندہ روٹو چل جائیں مگر یہ ملنا بھی کی
ملنا ہوا کہ وہیں میل رہی ہیں۔ اور یہں پل رہی ہے
اب رہی ذریگی ترہ "پل چلاو" کا دروازا
نام ہے۔ اہنہاگھر میں بیٹھی ہوئیں پلی ہیں اور
ان کی زبان پہلتی ہے تو یہ ایک قانون فطر
یعنی اس میں کار چلانے والی خواتین کا کرن لائق
نہیں بلکہ اس ادمی کا تصور ہے جو کار کے
چلے یا مرد کی خوبی چلے۔

پہنچتے پہنچتے آدمی رات ہو جائے۔ اور
دنیا کے دوسرے شہروں میں ایسے امیر ادمی
چود چکار ان کے گھر پہنچتے سے پہلے گھر کا
جیسا کچھ بام سوڑ کا دیا ہوتا ہے وہ شہر سے
دور شہر کے مضافات میں رہتے ہیں اور
غريب اور متوسط طبقے کے لوگ انہوں نے

پاکستان کے شہروں بالخصوص کراچی
شہر باشے جاتے ہیں
پاکستان بالخصوص کراچی میں آباد کا

یکجا پیدل پہنچ کئے پہلے سے صحت مند ہونا
بھی ضروری ہے۔

صحت کے اس اولین اصول سے جب
سارے شہری واقف ہیں تو چھر رہ پیدل کیوں
نہیں چلتے۔؟

اس سوال کا آسان ترین جواب ہے
”مجددی“۔

امروں کے لئے یہ بھروسی ہے کہ اگر وہ
ہر دل پھرتے ہیں تو لوگ ان پر انگلیاں
اٹھاتے ہیں کہ

”لوچی“ معلوم ہوتا ہے کہ دولت خا
صاحب کا دیوالیسہ نکل گیا ہے۔
”مرٹکوں پر جو تیال چٹخاتے چھر ہیں“
”معلوم ہوتا ہے کہ قرض خواہوں نے موڑ
ضبط کر لائے۔“

لوگوں کے ان ”اوائلیں“ سے ذکر
دولت خاں بے چارے کار میں گھونٹ پر جو ہیں
”کار“ میں بیٹھے ہیں اور ”ڈکار“ لے رہے ہیں

متوسط اور غرب طبقے کے لوگوں کی بھروسی
یہ ہے کہ انہیں بس جلدی کام پر بہنچا ہوتا ہے
شام جلدی گھر لوٹنا پڑتا ہے۔

اگر بچ پیدل کام کے لئے روانہ ہوں تو
دیر سے کام پر بہنچیں اور فوکری رفتگار
خلرے میں رہ جائے۔

اگر شام کو پیدل گھر روانہ ہوں تو

ہو چکا ہے۔

ایک روز کھیلیں تو سو ڈکاریں لیں۔ کچھ دن ڈاکٹروں سے علاج کرایا لیکن ہمارے مکان میں ڈاکٹری علاج کچھ ایسا ہے کہ "جسمانی" سنبھلنے لگتی ہے تو "مالی مال" گرنے لگتی ہے۔

چنانچہ ہر ہفتہ جو رپورٹ ہم اپنے گھر کے رشن، بچوں کی تعلیمی نیس اور دینگہ فروختی نندگی کے نئے نکلتے ہیں۔ اس روپ کے ایک پڑا حصہ علاج کے نام پر ہماری ذات پر خرچ ہونے لگتا ہے۔

ہمیں اپنی اس "خود غرضی" پر بڑی نمائت ہوتی اور ہم نے تہذیب کرایا کہ ہماری بیماری خواہ کھنی ہی خطرناک ہو جائے ہم گھر کے رشن اور بچوں کی تعلیمی فیس و غیرہ غیرہ کے لئے کمایا ہو اور دیپر اپنی ذات پر خرچ کر کے اپنے اہل و عیال کی حق تھوڑی نہیں کریں گے۔

جس شام ہم نے یہ عزم بالجذم کیا اسی شام ایک فیر ملکی سفارت فلسفی کی دعوت میں حکیم حسین سعید صاحب دہلوی سے ہمارا تعازہ ہوا۔ جب ہم نے حکیم صاحب سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "آنفوب۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوتی۔ آنفوب یہ تو حکیم سعید صاحب نے تشوش کا نظر میں سے ہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

بہبہا لگکہ پاکستان زرعی سے ضمیم ہے۔

جا ہے جس کی وجہ سے دیہاتی شہروں کی طرف رُخ کر رہے ہیں اور شہروں کی آبادی دن بہن بڑھتی جا رہی ہے۔

شہروں کی آبادی بڑھنے کے باعث

بھی لوگوں کا پیدل چلنے والی بدن کم ہوتا جاتا ہے۔

ہر جب تک آبادی کم تھی لوگ کھلے کھلے

مکان بنلاتے تھے یعنی ان میں چیل قدمی

کے لئے صحن بھی ہوتے تھے۔ اب آبادی

بڑھنے کے باعث صحن پا محل فائب ہو گئے

ہیں۔ نیلیں سسٹم شروع ہو گیا ہے اور

نیلیں سسٹم میں "امیجپڈ باتھر دم"

لازی ہے۔

پہلے لوگ کمر سے فصل فلانے اور

بیت الملاجہ کی تپیدل چل یا رتے تھے اب

گزیگا کا دل دلہ کھلا ہو تو یون محروس ہو جیے۔

بینہ دوم میں نہیں بلکہ بیت الملاجہ میں سیہیں ہیں

اب بندہ بشر پیدل چلے تو کہاں چلے۔

عجب الاذانات ہے۔

پائے مرافق لگتے

ابتدی نت خنی سواریوں کی ایجاد آباد کاری

کے فلا منصوبوں، مہنگائی اور خرابی

نے تو واقعی جیسے ملک خدا کو تنگ کر کر کا

ہے۔ (۲)

ادھر چند ہمیں دیے ہے ہماری صحت

دلخیل گرتی جا رہی تھی۔ ایسا محروس ہوتا

تھا جیسے مددے کی قوت ہضم بالکل ختم

بھلے اس کے بیکس ہے۔

یہے صاحب استھافت لوگوں کے

پاس موڑ کا دیں ہیں انہیں قد اندرونی خبر

کر ٹھیاں یا پلاٹ الائٹ کئے جائے ہیں زور

جن غرب متسلط طبقہ کے لوگوں کے پاس

سائکل تک نہیں، انہیں شہر مدرس دس

بیس میں میں عدد آباد کیا گیا ہے۔

حالانکہ ان لوگوں کو ان کے دفتروں اور

دہنہ گار سے قریب تر کئی کئی منزلہ عمارتیں

بن کر آباد کرنا چاہیئے تھا اور ان صاحب

استھافت لوگوں کو جن کے پاس کا رہیں

شہر سے دور مبتلا لانڈھی، لوگ روڑ،

سعود آباد، بیخو کراچی وغیرہ میں بسایا جانا

چاہیئے تھا۔

غیر جو ہوا سو ہوا، اب کیا ہو سکتا ہے

بہر حال بات پیدل چلنے کی جو رہی تھی۔

اب اتنی دوسرے ہنے والے غرب

اور متسلط طبقہ کے لوگ پیدل چلتے بھی

چاہیں توہینیں چل سکتے یہ لوگ پیدل چلنے

سے بھوک تھب لگتے ہے۔ ایک روٹی کا

والا دور رٹی کھانے پر محروم ہوتا ہے۔ ب

ہنگامی اور کم آمد کے باعث بے شمار

انسانوں کے لئے ایک ہی روٹی مشکل ملتی

ہے تو دیہاتیوں کیا ہے میں گی؟

چنانچہ غرب آدمی مجبراً پیدل چلنے

سے گریز کرتے اس تکہ بھوک کم لگے

اور رہنمی کم خرچ ہو۔

شگفتہ می ۸۷

”کی کراچی میں انسیں کھلے رہے ہیں، یا بارش یا
میدانی ایسا بھی ہے جو ان شرطی چیزوں کی وجہ
بڑی سوچ پر بچار کے بعد ہم نے طے کیا تھا۔ حقیقت
کنٹرول کلب مونٹگومنیزیشن دعویٰ
تمثیل کر رہے ہیں۔ اس پر ٹرینیگ کم ہوتے
پڑا تو ڈائیٹریٹر پیس میں الارام لگا کر سوکتے۔ بس
الارام کے ساتھ جیلہ ہوئے۔ خلیل احمد خاں
کے فارغ ہو کر گھر سے باہر نکلے تو ابھی بھا
گھر اندھیرا تھا لیکن ہم لپٹنے سیاسی عقیدے
کے تحت اندھیرے کے دھون اور آفایلے کے
نقیب ہیں۔ اس کے اندھیرے کی پر ماہنگی
بھی تھیں۔ ہی دنگ دنگ تھے کہ ایک
باذادی گتہ ہم پر ہجوم کا۔ اس کا بھرناکہ ہی
تحاکہ اس کی مجلس حاصلہ کے سارے رائکن
ہمارے چھپے لگ گئے۔ انھیں ملا جھگانے
کے لئے اینٹ پتھر تلاش کئے تو پتہ چلا کہ
ہے اہل دل کے لئے اب یہ نظریت دکھاند
کر سکے وخت مقدمہ ہی اور سکنڈ آزاد
لیکن ہم ہانتے تھے کہ

”مگرے بھونکتے ہے تو اس کا بدمداد گزنا
دہتا ہے۔“
”بھونکنے والے کتنے کاٹتے ہیں؟“
اس نے اطمینان سے آگے بڑھتے چلے
گئے۔

مدد نیور مٹی روڈ سنگھ تھی ہم نے سورج
کرتیز تیز پیدل پلٹن کے بھائے دوڑ کیوں
نہ لگانے چاہئے ۔

پریل چلا کریں۔ اونہ جتنا تیر ملیں بکتے ہیں
چلیں۔

دو ایساں اور مشورے لے کر گھر
پہنچے۔ دوست احباب سے ماجرا بیان کی
توہر دوست نے پریل چلنے کے فوائد بیان
کرنے شروع کر دیئے۔
خواہیں حسیناً نے کہا
”ایک میل پریل چلا سو رواؤں اور
بچاس انجکشنوں کے باپ رہے ہے“
یعنی رحمت الہی نے فرمایا۔

”ایک میل پریل چلنے سے مدد کرہ ہضم
پتھر ہضم ہو جاتا ہے۔
ہم نے پوچھا ڈیش صاحب ۔ یہ
لکڑہ ہضم، پتھر ہضم والا محاورہ تربیت پڑانا
ہے اور اس سے یہ شیر ہجاتا ہے کہ پرانے
ننانے کے دو کانداد بھی کھانے پینے کی چزیں
میں گنگر پتھر اند لکڑی کا برا دہ ملایا کرتے
تمہارے

شیخ رحمت الہی نے نہایت سادگی سے جواب
زیا۔ ” میں اس بارے میں اس لئے کچھ نہیں
بیان کیا گوئیکر پڑائے زمانے میں میں موجود
ہی نہیں تھا۔ ”

مات ہم نے پروگرام بنایا کہ کل بجع
سے روزانہ ایک میل بیل چلا کریں گے۔
لیکن سوال یہ تھا کہ —

"آپ کو مجھ سے مل کر جو خوشی ہوئی ہے
وہ دو ڈکار دل کے دد میان ہوئی ہے لہذا
کیا آپ مجھ سے مل میرے ملکب پر مل سکتے
ہیں۔"

"مطلب پر ملنا" سہارے "مطلوب" ایک
بات تھی اوسیم نے پہلے کبھی یونانی علاج بھی
نہیں کرایا تھا لہذا ہم نے پھر دد کاروں کے
درمیان اپنی خوشی نظامی کی

"آنکہ - بڑی خوشی سے - آنکہ؟"

دوسرے دن سویلے ہم ہمدد دواخانہ
بہنچے اور حکیم سعید صاحب کو اٹلانا کر دائی
کہ آدم برسے "مطب"
حکیم صاحب نے بھض پہ ہاتھ دکھ کر قبض
سک بڑی تشویش سے مرض کی خدا جانے
تشخیص کی کہ نسخہ فاک سمجھ میں نہ آیا۔ حکیم
کے کچھ لپچھا اس لئے نہیں کہ
مفت راجہ گفت

عکیم صاحبینے البتہ یوچا
”آپ روزانہ کتنا پیدل چلتے ہیں؟“
ہم نے بتایا۔ ”اندھے کمرے سے چل
خانہ کے

باہر — گھر سے بس اٹاپ تک۔
حکم صاحب نے انہیاں راست متعالب کیا
”بس — صرف بس اٹاپ تک“

ادب پھر مشعرہ دیا کر
• آپ روزانہ کم اذکم ایک میل فرو

منظر حسین نے کہا
”باتیں نہ بنائیے۔ میں اپنے مکن کے اوروں
اور مخالفوں کی مانی مانست ہے اچھی طرح قبضہ
ہوں۔ آئیٹھے کار بیس بیٹھ جائیے۔“

ہم نے انکار کیا اور اپنے ارادے پر اٹل
رہے تو مظفر حسین جو فوجی وردی میں ملبوس
تھے کار سے اترے اور بھاول روشنی میں کھڑا

”بیکار کی خرد داد کار ہے دیجئے اور
کار میں بیٹھ جائیے!“

منظر صاحب نہ سر چاہے فوجی آدمی، انہوں
نے ذہر دستی ہیں کار میں دھکیلا شروع کیا
راہ گیر جم ہونے لگے۔ ہم اس ڈسے کہ کہیں
راہ گیر یہ نہ سمجھیں کہ ہماری اگر فاری ہو رہی ہے
”غڑاپ“ سے خود ہی کار میں جائیجئے اور
منظر صاحب نے ہمیں دفتر پر ”ڈر اپ“ کر دیا۔

شام تک ہم دفتر میں بیٹھے کوئی کھاتے
رہے۔ شام کو جب سورج سوانیزے پہ رہ گیا
تو ہم نے سوچا کہ اب دفتر سے میری دیدار مادر
تک پیدل جائیدگے۔

دفتر سے جامع کا تھوڑا کیٹ سکیے پہنچے
تو اب پریشانی یہ کہ فٹ پاٹھ پر کیسے چلیں؟
پہ دعا کا نہ اسٹیٹھے ہے۔ فٹ پاٹھ سے شیخ اُترتے
ہیں تو کسی بس، موٹر یا کرکٹ کے نیچے آجائے
کا ڈر۔

فٹ پاٹھ پر چلتے ہیں تو میرنپل کا پورشیں
پر غصہ آتا ہے۔ فٹ پاٹھ سے سڑک پر آتے

منظر حسین نے ہمیں تیز پڑھنے کو کہا۔
”ابی، یہ فرانگ بیگانہ دو ڈپلٹس تھے کہ چھڑا
چھڑا رہیا بنئے گیں۔“ اور کہنے دے گیا تھا میں پس تیز پڑھنے کی۔
”تم نے پاٹھ کر دیکھا تو دہ ساہی ہے مگر ہم نے اور
چیخے دوڑھے چلے آئے ہیں۔ پوتیں والوں
نے ہمیں آیا۔ پوچھ چکر شروع ہو گیا۔ ہم
نے ان سیاہی سے کہا۔

”ہم کو چور داکو نہیں ہیں، یہ تو
سپاہیوں نے دفتر میں پیدل چلا جائے۔“
”دوڑھ بیج گاہی“ ہے
چانچھم دفتر کھلئے پیدل روانہ ہو گئے
دھوپ اتنی تیز تھی کہ چھٹی سا پینیہ ایڑی
”قبذگاہی“ یہ دوڑھ بیج گاہی کیسی
اس وقت تو رات کے دو بجے ہیں“ کے پختے۔
”بعانی ہماری ٹائم پس دو گھنٹے تیز
تو نہیں چل سکتے۔“

”سچا ہیوں نے کہا
”مگر آپ تو تھانے چل سکتے ہیں!“
”خانے“ کا قافیہ ”کھانے“ سے بھی مطلے
لیکن جب ان سپاہیوں نے ہمارا نام سنا
اور پھر سارا ما جلا۔ تو بڑھنے سے - ہنڑو
پاہی پڑھے لیکھ اور مہد ب تھے اس لئے
خانے کھانے کا فربت نہ آئی بلکہ وہ اپنی
حفاظت میں ہیں گھر بینچا گئے۔

ہماری ٹائم پس میں اس وقت سڑھے
پانچ نجھ بھتھے اور رشت دار پیں دھنپیں
”سوت کا فاتر کردا ایسی دھنپ میں
پیدل چلا جاتا ہے۔“

خیال آیا کہ کسی بالمحاجہ میں ٹھندا پا ہے۔ اس شہر میں نہ کہوں میرگا ہیں ہیں نہ عذش
ناچار سڑک کے کنارے کنائے اس کے اکھاؤ سے اندھن کھیل کے بیلان۔
طرح پلنے لگے کہ منہ تو پیچے کی طرف کو کیس آیا میں نہ نچے اور فوکر پا کر قسم کے لوگ
پیدل نہ پلٹے قریحہ خلے میں ایک باضیچے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ
پیدل چلتے تو جان اور قدم آگے کوئی بس تو نہیں اور ہم ہے اور قدم آگے
جیرت تو یہ ہے کہ اس شہر میں کے ڈی
لے، یعنی کوچی کا ترقیات محلہ بھی ہے اور ڈیپل
کا پیش بھی۔ لیکن عوام کےئے "صحت گاہیں"
کہیں نہیں ہیں۔

چھنے یہ ساری دلستان حکیم سعید صاحب کو اندھہ
سارے دوست اجبا کرناٹی۔ حکیم سعید صاحب نے کہا
ہے، "پیدل چلنے پر لعنت سمجھو۔ ہر شام میرے
ساقطہ میںں کھیلا کرو۔"

سامنے دوست احباب بالمحاجہ یہی مشروہ
ہے کہ "اب پیدل نہ چو کر د۔"

مگر ہمارے ایک دوست صابر علی ہیں۔ ان کا
اصراحت ہے کہ ہم ضرور پیدل چلا کریں صابر علی ہماری
جان کوئے ہیں کہ ہم پیدل ہی چلا کریں اور ضرور پیدل
چلا کریں۔ صابر علی کے اصرار کی وجہ یہ ہے کہ
ان کی جگتوں کی ایک دلکان ہے۔

خیال آیا کہ کسی بالمحاجہ میں ٹھندا پا ہے۔
ایک باضیچے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ
پیدل نہ پلٹے قریحہ خلے میں ایک باضیچے میں
پیدل چلتے تو جان اور قدم آگے
تھے کہ کسی نے پھاپن بیا اور تہایت شرات
آمیز انداز میں کھنکا رکھ کر پوچھا۔

"کیوں صاحب، آپ یہاں کیسے؟"
وہ شخص ہمارے ایک دوست کا غناسماں
تحا نہایت وابہیات ہے جسے میں بولا۔
"یہ تو آیاں اور غناسماں کا پارک
ہے، آپ کس پکر میں یہاں آگئے۔"

ہم نے اسے ذکر کیے نکلوانے کی
دھمکی دی اور تیزی سے پارک سے باہر
نکل آئے۔

اور ماوس ہو کر سوچنے لگے۔
"اہمی۔ یہ ہماری شہری زندگی بھی کیسی
مصنوعی غیر فطری اور مفتر صحت ہے۔
اتا بڑا شہر اور صحت کی خاطر پیدل چلنے
کے لئے فرلانگ بھر جگہ بھی نہیں۔"

پیدل چلنے سے کیا فائدہ۔

ہیں تو شریفک پریس پر غصہ آتے۔
ایک باضیچے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ
کوئی بس تو نہیں اور ہم ہے اور قدم آگے
کی طرف۔ اچانک ایک نسوان غصیل آواز
نے پوچھا۔

"کیا ہماری کوئی ماں ہیں نہیں ہے؟"
ہم نے معافی مانگی اور اُسے یقین دلایا
کہ "ہماری تو ایک بیوی بھی ہے۔"

عورت کوئی شریف ذات محظی نہ ہے اس کی
عزت پنج گنہ۔ معاملہ رفع اور عورت دفع۔

معاً خیال آیا کہ میکلود روڈ کے فٹ
پاکتوں پر دو کامیں اور بھر بھر کا نہیں ہتا
اس نے ہم میکلود روڈ پر آگئے۔

ہماری بد قسمی کہ اس وقت میکلود روڈ
کے دفاتر میں چھٹی ہوئی تھی۔ ہر دو قدم کے
بعد ایک دوست یا طلاقی ہتا تھا۔ دو
قدم چلتے اندھس منٹ ٹھر گئے۔ یہی
پیدل چلنے سے کیا فائدہ۔

رسوان احمد
کے افسانوں کا مجموعہ

مسدود راہوں کے مسافر

خوبصورت بت و طباعت، خوشخبروں

صفحات ۱۲۸

نیو پلی کیشنز باقر گنج پٹنہ ۳۰۰۰۰۸
قیمت: دس روپے (بادھہ بیچن صولڈ)

ابراهیم بلیس

میاں شوہر

بیوی شوفر

کل تک میتے کو اپنے تو سلاسلکتی نہ تھی
آج بند روڈ پر موڑ چلا سکتی ہے تو

آج اُل پاکتی خاتین میں موڑ راسوکرنے یعنی خود موڑ چلانے کا شوق دن بدن بڑھتا جاتا ہے۔ جب سے خود توں ہی سیلف (۵۶-۷۲) یعنی "خودی" بیمار ہوئی ہے وہ سیلف ڈرائیونگ کو بھی خالی تحریخ دے رہی ہیں۔ چنانچہ آج پاکستانی شہروں کی صدر کوں پر مدد توں کے موڑ چلنے کا انوارہ عام ہے۔

پہلے تو کاسکی سواری کے لیے ہماری خواتین یا تو "شوہر" کی صحاب ہوتی ہیں یا "بھر شوہر" لیکن خواتین میں سماجی بیماری نے جہاں خود توں گٹھہرہ کی خاتی سے آناد کر دیا ہے یا کر رہی ہے وہاں عورت "شوفر" کی محاذی سے بھی آزاد ہوئی جا رہی ہے۔ اب تو عالم یہ بوجیا ہے کہ کار میں بیوی وہاں بیٹھی ہے جہاں پہلے شوہر یا شوفر بیٹھا تھا اور شوہر یا شوفرد وہاں بیٹھتے ہیں جہاں پہلے بیوی یا بیگم صاحب بیٹھتی تھیں۔

ایک ماہ سے استیرنگ گھار ہی ہیں تو دمرے ہاتھ سے ڈوبہ سنجھاں رہی ہیں اور جہاں ٹرینیک سگنا، یا ٹرینیک کانٹیل نے ٹرینیک روک دی۔ بس انھوں نے فوراً اپنے ٹائمٹ بیگ سے لپ اشک نکالی اور تھستے بیک مرد میں جانک کر ہونٹوں پر لالی گلاني شروع کر دی۔

اوہ بعض اوقات تو یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ٹرینیک کی ہری بی بھی جل اٹھی سگنگم صاحب کی ہونٹوں کی کافی ٹرینیک کو دے کے ہوئے ہی ہے۔

کار میں دنداشکرین کے اوپر جو چوتا سا آئینہ لگا، اس ہوتا ہے اس کا اصل مصرف تو یہ ہے کہ کار چلانے والے اس کے دریو پیچے آئنے والی گاڑیوں پر نظر رکھیں لیکن خواتین کو ستایدی بات ابھی تک معلوم نہیں ہوئی اور وہ انسنے نیک کے بجائے ٹائمٹ مرہبی بگھتی ہیں احمد ایک خاتون کا استدلال تو یہ ہے کہ جس کار میں بیک ہو، ہوتا ہے وہ ساصل لیڈر کا رہے

اگر یہ استدلال صحیح ہے تو پھر ہر کار لیڈز کا رہے۔ کیونکہ یہ چھٹا سا اینہ تقریباً ہر کار میں لگا ہو سکتے ہیں۔ اسی کے علاوہ یہ استدلال ہیں اس میں یہ بھی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ استدلال میں بھی فقط "لال" موجود ہے اور اپ اسک بھی لال رنگ کی ہوتی ہے اور بھجوئے کرنے بالعوم اپ اسک لگانے کے میں ہی ہوتے ہیں۔

عورتوں کے کار چلانے پر سمجھ تو کوئی اصرار عن نہیں ہاں الیتہ شہر کے محکمہ بھیں یا محکمہ شیخوں کو تو ہم کچھ نہیں کہ سکتے کیونکہ سرکوں پر جتنے کمبسے لگے ہوتے ہیں وہ یا تو بجلی کے ہوتے ہیں یا شیکافون گے۔ سمجھیں کار چلانے والی خواتین کا درجہ کیے استعمال کرتی ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ خواتین نے ابھی خیانا کار چلانا اسیکے لیے لیکن کار روکنا نہیں سیکھا دیے مقام شکریہ ہے کہ ہماری کار چلانے والی خواتین نے راہ گروں سے کار روکنے میں اپنے بڑی احتیاط سے کام بیہے۔ دیسے اگر کوئی اکے دو گئے واقعات بھی ہوئے ہیں جس میں کار چلانے والی عورت نے بریک کے بجائے راہ گروں سے کار روکی ہو تو وہ معاملہ اور ہی ہے یعنی اس میں کار چلانے والی خاتون کا کوئی قصور نہیں بلکہ اس آدمی کا تصور ہے جو کار کے سامنے یا کار کے نیچے آیا۔ ایسے واقعات کے بارے میں شعری توجیہ "تو یہ ہے کہ جس کو مت آتی نہیں ہے عشق کے آزار سے دب کے مر جاتا ہے وہ لیڈی کی موڑ کار سے

خواتین میں موڑ چلانے کے دن بدن بڑھتے ہوئے شوق کے منظر جب پان کی ایک موڑ ساز لکنی نے عورتوں کے میں ایک مخصوص موڑ کار ایجاد کی ہے جس کی قیمت ایک سو ڈال رتبائی گئی ہے۔ اس موڑ کار میں خواتین کے سلسلہ حوار اور تبدیلی لیا اس کا معقول انتظام رکھا گیا ہے۔ یعنی کار چلاتے ہوئے گیریدنے کے علاوہ وہ بس بھی دل سکتی ہیں اور بریک لگانے کے ساتھ ساتھ وہ اپ اسک بھی لکاسٹر آئے ہیں۔ بالخصوص اس کے اسٹینرنس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ اسی بنا یا گیا ہے کہ عورت کا اس سے ہی تعلق خاطر پیدا ہو سکتا ہے جو بالعوم "میری رنگیا نیجھٹ رنگ" (Marriage Ring or Engagement Ring) سے ہوتا ہے۔

عورتوں کے لیے لیڈر زیڈ لارڈ "نہایت ضروری ہے۔ جب لیڈر زیڈ ملٹکل" مردوں کی بائیکل سے مختلف ہو جاتے ہیں عورتوں کی کار بھی عورتوں کی طرح سیک، نازک انعام اور خوب صورت ہو فی چلے ہیے یہ چلا کیا ہے کہ کار اتنی بڑی اور کار چلانے والی خاتون اتنی بھجوئی کے نظر ہی نہیں آئے اور لوگ سمجھیں کہ غیر ڈرائیور کے کوئی آڈیٹکس کار دوڑی جارہی ہے یا چھر رنٹا ہر ہو کہ کار چلاتے والی خاتون یہ دے کی سنبھی سے پاہتہ ہے میں ہم نے کراچی میں پرده نشینی اور کار ڈرائیور کو لکھتے بھی دیکھا ہے۔ کراچی میں ایک خاتون اسی بھی ہیں جو چھر پورہ پر قعداً اور کھڑکر چھرے کو نقاب سے اچھی طرح ڈھانک کر کار چلاتی ہیں۔ سمجھیں ہمیک نظر دیکھنے سے ہوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی نقاب پوش ڈاکوکی کی کار اڑائے یہی جا رہا ہے۔ وہ خاتون میں محفوظ کریں۔ یہ حسن نظر کے دھوکے اور اس کی ہمارت کی بات ہے۔ ہم خواتین کے کار چلانے کے قطعاً مخالف نہیں بلکہ ہم قوی چاہتے ہیں کہ ہماری خواتین صرف کار ہی نہ چلاں بلکہ اس چلاں۔ ٹرک چلاں، اولی چلاں، ہماری چلاں۔ ہماری قوری خاتون ہیں ہے کہ پاکستان کی ہمار

عورت کا رچلانے ہے تو پوچھیں "بھی چلا میں۔ آپا میں بھی چلا میں، بیکر بھی چلا میں اور بنی بھی چلا میں۔ زمانہ اب بہت بڑا گیا ہے، اب دنماز نہیں رک جب کہ اپنے ملک میں
"مال بچے کو گود میں لے بیٹھتی تھی اور باپ حتر پیٹتا تھا۔"

اپنے وہ زمانہ آگپا ہے کہ

بیاپ بیپے کو گود میں لیے بیوی کے ساتھ بیٹھا ہے اور بیوی موڑ چلا رہی ہے۔"

آزادی نساں کی عتریک نے جب عورت کو مرد کے برابر کا درجہ دے دیا ہے تو عورت اور مرد لفظی اعتبار سے بھی برابر ہوئیں ہیں اس شوہر تو عورت شوفر ہے

کیا مزاکے کا یار و جب چلائے گی وہ کار

ہر سڑک ہو جائے گی چہرے سے اسکے لاڈار

(انتخاب اذکاءب۔ اور پر شیر دالی اندر پر شیانی) ۰۰

نامور مزاح نگار یوسف ناظم

کی دوڑ نئی کتابیں

سائے اور ہمسائے فقط

(فائدے کے)

(مزاحیہ مضامین)

قیمت: چھ روپے

ترتیب شکوفہ عب کیجے

ابراہیم جلیس

زنا فشدار

دنیا میں بعض لوگ بڑے عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ ان کی عادت اور حرکات و سکنات عام انسانوں سے قطعاً مختلف ہوتی ہیں۔ ان کی عادت و حرکات و سکنات کو دیکھ کر ایک عام آدمی کا چونک پڑنا اور حسیں ان ہر نالازمی بات ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا شمار بھی ایسے عجیب و غریب انسانوں میں ہوتا ہے۔

اپ یقین کریں یا نہ کریں — یہ لکھ اپ تو ہم کو خود بھی یقین نہیں آتا کہ صرف ایک "کوٹ ہینگر" کے لیے ہم نے زندگی میں یہی بار کوٹ سلوایا اور پھر اس کوٹ کی خاطر ہم ایک پستلوں سلوانی پڑی۔ کوٹ اصل تباون جو نکر نیز نہ کیا "کے پہننا خلاف فیشن ہے اس لئے ہم نے نکلائی بھی خریدی۔

اس طرح زندگی میں پہلا سوٹ ہم نے اس لیے ہیتا کہ ہمارے ایک دوست نے ایک کوٹ ہینگر میں سطور حفظ دیا تھا۔ صرف یہ ایک کوٹ ہینگر ہی نہیں بلکہ ایسی ہی صحیحی چیزوں نے ہماری زندگی کے بڑے فاقعات کو جنم دیا ہے۔ مثلاً۔

**ہماری سگریٹ تو شی
ہماری شادی**

اوہماری کالم تو سیما و فیرہ و غیرہ

اینی عمر کے ابتدائی ۲۰ سال تک ہم نے کبھی سگریٹ نہیں لی۔ ان دونوں ہم علی گروہ ڈنہوری میں بنی لے کے آخری سال میں پڑھ رہے تھے۔ ہمارا ایک دوست ہم سے ہمارا ایک گم کوٹ یعنی "چستر" ہماریا ہم سے مانگ کر لے گیا۔ دوسرے دن وہ کوٹ واپس کر گیا تو اس کی ایک دیا سلامی کی ذیبا کوٹ کی جیب میں رہ گئی۔

ہر رسم نے سوچا کہ اس کی دیا سلامی کی ذیبا اسے واپس کر دی جائے میکن پستھلاکرو وہ دوست ڈنہوری میں سے تکال دیا گیا ہے۔ کیس کہ ہم پریشان ہو گئے کہ اس دیا سلامی کی ذیبا کا ہم کیا کریں ۔ ہر تے اسی ذیبا کو اپنے دوست کی یادگار کے ٹوپر پر اٹھا کر رکھ دیا۔ لیکن دیا سلامی کی دوڑیں لختے بیٹھے سوتے جاتے ہماری نکاہی میں کھٹکنے لگی۔

گھوادہ میز پر ہم دھرمی تھی ہمارے اصحاب پر رکھی ہوئی تھی۔

ہم اسے اٹھا کر رہ نہیں چیلک سکتے تھے لیکن ہمارے ایک عزیز دوست کی ایک یادگار تھی۔ جب وہ دیا سلامی

کی ذبیح ہمارے اعصاب پر ناقابل بینا شتہ بوجی تو ہم نے پئے دوستوں سے مشمود کیا کہ
ایک دیا سلا لائی کی ذبیح کا بہترین معرف کیا ہو سکتا ہے۔

پھر جانے کے لیے بیکار سکریٹ جلالت تک دوستوں نے دیا سلا لائی کی ذبیح کے متعدد معرف بتاتے لیکن ہمیں
سکریٹ جلالت کا معرف زیادہ مستر (دینی فائدہ) نظر آیا اور ہم نے فوراً کوئہ فلیک کی ایک ذبیح منگرا لی اور وہ دن
اچھا چ کا دن ہے۔

چھٹی نہیں ہے منہ سے یہ سکریٹ لگی ہوئی

بخاری کالم نویسی کا خازی بھی کچھ انسانی دل چسپ ہے۔ قیام پاکستان کے بعد جب ہم پہلیان حال
بنا ہوئی کر لایا ہو سچے اور رونق تاخیر امر صدقہ میں بخشش سب ایدی ٹیکڑا خاکہ ہوتے تو ایک دن ہمارے دیواری اعلیٰ اور نویسیں
کے شہزادہ مولانا چوڑخ حسن حضرت نے ہماری تحریر سے خوش ہو کر اپنا داد فاد نہیں پکی ہیں انعام دیا جس سے وہ حرف د
حکایت کا مشہور نکاحی کالم محاکمہ کرتے تھے۔

مولانا چوڑخ حسن حضرت کی سمجھی گئی میں ہمارا فکاری کالم بخدا سو سے ادب کے متراقب تھاماس یہ ہم نے ان کے اس
تغفوک توں اپنے سے لکھتے رکھا (یعنی کوٹ کے اندھے کی جیسی ہی بہشہ دل کے پاس پھیلتے رکھا)
اہم پھر جب فلک کھر فارس نے مولانا حضرت کا سایہ ہمارے سر سے چھین لیا اور جائے استاد تھائی بوجی تو ہم بھی فکاری
کالم کے میدان میں کرد پڑھے۔

مولانا حضرت کے اٹھ جانے سے فکاری کالم نویسی میں خو خلا پیدا ہو گیا ہے اسے ایک ہزار ارب ایکم جلیس بھی پڑھی
کر سکتے۔ تاہم ہم نے مولانا حضرت کی کالم نویسی کے ماہتاب کے آنے اپنی کالم نویسی کی ایک ختمی سی شمع جلان رکھی ہے۔
سب سے نیا ہو، ہم اسے دل چسپ واقعہ ہماری شادی کا ہے۔

علی گزیع کی نایش کے ایک انسانی مخالبے میں ہم نے بھی ایک انعامی ٹیکٹ خریدا تھا اور اس انعامی ٹیکٹ پر
ہمیں ایک "زنافی شلوار اور جپیر انعام طلبہ اس پر شد منہ بھی ہوئے لھڈ جیسا بھی"۔
اینی آفاسی طبیعت کے باعث ہم شادی کر کے کسی خاتون کی زندگی خراب کرنا نہیں چاہئے تھے۔ اس یہے ہم
پہنچ لے یا تھا کہ ہم زندگی سبھر جا سچ بزم ایڈ شارپس گے لیکن یہ زنافی شلوار اور جپیر کا انعام ہیں کیا ٹاکر ہمارا ستادی نہ کرنے
کا اٹھ پہنچ لے ستر قتل ہو گیا۔

اس زنافی شلوار اور جپیر کے لیے ہمیں ایک عکشیرہ درکار تھی۔

کوئی روکنیاں ہمیں پہنچتا آئیں اور کمی رکھنیں نے ہمیں بھی پہنچتا یا لیکن وہ زنافی شلوار اور جپیر انہیں فست پہنچیں آئے۔
ہماری والدہ زنافی شلوار اور جپیر لیے سارے سہندستان میں رشتہ داروں اور جان پیچان کے لوگوں
کے گھروں میں جاتی رہیں۔ بالآخر ایک دن ریاست حیدر آباد کوئی کے ایک شہر جپیر کی شریفی کے سو داگروں کی ایک رٹکی
کو وہ شلدار قسمیں فٹ آگئی۔ ہماری والدہ نے ہم سے جپیر کا کہا کہ
"پہلے رٹکی کو بھی تو دیکھو لو۔"

لیکن ہم نے کہا کہ وہ شلدار قسمیں فٹ آگئی ہے تو مجھ دیکھنے دکھانے کی یا ضرورت ہے لیس اب قٹافی نکلن
فت کر دو۔

چنانچہ ہی شلوار اور قصض دین کا لیاں عربی بھی بتا اور اب ہماری ازدواجی زندگی میں اس شلوار اور قصض کو دہی اپنی
حاصل ہے جو میدانِ جنگ میں عمل کے سفیدِ جنڈے کو حاصل ہے۔ یعنی جب کبھی ہماری بیوی سے لڑائی ہو جاتی ہے تو وہ فائدہ
شلوار اور قصض پہن کر ہمارے ساتھ آ جاتی ہے لے دیکھ کر ہم لڑائی میں بند کرتے ہیں اور فارسی شروع کرتے ہیں کہ
تو ہی شدی میں تو تقدم من تن شدم تو جان شدی

تارکس نہ گویہ بعد ازاں، من دیکرم تو دیکھنا،

اب ایسے ہی ایک داقعہ نے ہمیں آج کل پریشان کر رکھا ہے ہمارے دوست عزیز اللہ جنگ نے شہری ایک "ڈراموں
ان سودی" MOVIE - IN - DRAMA یعنی نورگول میں بیخُور فلم دیکھنے کا تماشہ شروع کیا ہے اور ہمارے یوں دوست نے
اس ڈراموں سودی کا ایک ٹکٹ بطور تخفہ بھیجا ہے۔

وہ ٹکٹ فی الحال ہمارے پاس اس نے بیکار ہے کہ ہمارے پاس کامیابی ہے۔

ہماری افتاد طبع کا تعاہد تواریب یہی ہے کہ ہم ڈراموں سودی کے ٹکٹ کے لیے ایک موڑ کا بھی خریدیں۔۔۔
میکن دل سے مالوں کی ایک تھنڈی آہ لکھتی ہے اور دوستی سے بھی کوئی امید نہیں ہے کہ وہ
کار لائقت سے ہمیں یاد فرمائیں۔

لیکن اگر کبھی زندگی میں ہم نے کار خریدی تو اس کا سبب صرف یہی ڈراموں سودی کا ٹکٹ ہو گا۔

○○ (انتخاب از کتاب "پتے کی بات")

مُمتازہ مزاح نگار مجتبی حسین کی کتابیں

بہر حال	_____	7/-
قطع کلام	_____	3/5/-
قصہ مختصر	_____	6/-

بتوسطہ: شگوفہ

ممتازہ مزاح نگار چیز ویز یہ اسلام مہدی کے مفہومیں کا مجموعہ
چوری کے علم (جهیزی لفظ کے خلاف مذکورہ مزاحیہ مفہومیں)
 قسمت: ۷ و پہ

ابراهیم ملیس

جوں کا قول

حکام کے بارے میں عام کی شکایت بڑی عام ہے کہ
"حکام کے کان پر جوں نہیں روشنگتی"۔

جس کی وجہ سے عام کی ہر تکلیف اور ہر شکایت جوں کی توں باقی رہتا ہے۔

اب جوں جوں ہم جوں اور عام کی اسی شکایت پر غور کرتے چلتے جلتے ہیں۔ توں توں ہم پاس حیرتین کر دے "جوں" کی
اہمیت واضح ہوتی جیلی جاتی ہے۔

اہاب توہیں یہ لیقیں ہوتا جاتا ہے کہ ہماری حکومت اور معاشرے میں جتنی خرابیاں پائی جاتی ہیں ان کی اصل رو
صرف یہ ہے کہ..... ہمارے حکام کے سر کے بال کا جوڑ میں کوئی "جوں" نہیں ہے۔ پشتہ طیکہ حکام کے بال جوڑ سے
جھوڑنے لگے ہوں۔

اب تک توہم جوں کو ایک بڑا حیرا اور بے مصرف کیا سمجھا کرتے تھے اور جب تک کہ رس کراچی جیل میں نہیں ٹھونسا گیا
تھا۔ اس وقت تک ہمارا ذہن "جوں" کی طرف کبھی نگیا ہی نہیں تھا۔

لیکن کراچی جیل میں یہی رات جب ہمیں "کھوئی" تکنگے فرش پر کمبل بچانے کے لیے اتنا ایک کمبل اور ڈھنے کے لیے دیا گیا
تو ہمیں تھوڑی ہی فری بعده پتہ چل گیا کہ ان مکبلوں میں روشن کم اور جوش زیادہ نہیں۔

اور ہم ساری رات "جوں" کے بارے میں خور کرتے رہتے کہ۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے حیر کر دے کوئی
بے مصرف پیدا نہیں کیا ہے۔ لیس اس حیر سے حیر کر دے کامصرف یہ ہے کہ دو قیدیوں کو (جن کو سیاسی قیدیں کوئی) رات
بھر جانے بے۔

عرضہ دار تک ہم "جوں" کی جیل کی چار دیواری تک اس محدود فاقدیت سے ماقف تھے۔ لیکن کام جوں ہی "جوں" کے
بارے میں عام کی شکایت پر ہماری نظر پر ہی کر
"شکایت کے کان پر جوں نہیں روشنگتی"
تو جوں کی محدود فاقدیت بھی ہم پر ہیں ان بوجھی۔

اور آج تو ہم علی الاعلان بھتے ہیں کہ ہمارے حکم کی ساری خرابیوں کو کوئی مدد کر سکتی ہے اُن صرف بخوبی کی جوں یا جوں اگر حکام کے کافوں پرینگنا شروع کر دیں تو حکام کو عام کی شکایت اور تکالیف کو دلو کرنے کا احساس ہو۔ اور وہ اس احساس کی بدلت نہ ہے۔ حکم کام ہی نہ ہیں۔ بلکہ کام بھی کنا خرد کر دیں۔

اب سوال چڑھتے ہے کہ حکام کے سروں میں جوں کہاں سے آئیں۔ بیشتر حکام فارغ الیال ہوتے ہیں اور آپ جانشی کی گنجے۔

اور اس کا ثبوت یعنی ہے کہ "کچھ قانون" والے قانون بھی گنجے تھے۔ اب ہے وہ حکام جو فارغ الیال توہین ملکوں گنجے نہیں ہیں۔ وہ شمپو اور پیر دریںگ کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کے سروں میں بخل کے وجہ کا کوئی امکان نہیں رہتا۔

جب جوں کا "امکان" ہے، نہیں تو پھر وہ "کان" پر کیسے رینگے؟

اور وہ کان پر نہیں گے تو انہیں کیسے احساس ہو کہ عام کیوں ان کے کان کھا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ جوں کی کان پر عدم موجودگی کے باعث عام کی جو بھی بات سنیں گے تباہ کان سے سن کر دوسرا کان سے اڑادیں گے۔

بیجے ہو چکی۔ دکان داری!

حکام تو حکام۔ یہ عام بھی ہماری سمجھ میں نہیں آتے۔

جھونپرڈلوں میں مکیں اور میلے پھیلے گھنڈے کے پڑوں میں میوس سہتے ہیں لیکن مفلسوں کے باعثہ ان کے جوں پر بھی ہو جائیں۔

"حکام کے کان پر جوں نہیں رہیں گے۔"

جوں تھا رے مکان میں ہو تو حکام کے "کان" پر کہاں سے آئے۔؟

مگر عام حکومت کے نظمِ دفتر سے ایسے چونچی کر کر ترے نکال رہے ہیں جیسے بے انتہا کی اپنی ہمبوںیں بھاگاں کے سر سے چونچون کر جوں نکال رہی ہو۔ یعنی

— حکومت یہ نہیں کرتی حکومت وہ نہیں کرتی۔

— سرکوں پر خلقی حاجات کی لعک حکام کا بندوبست نہیں کرتا۔

— نواحی بستیوں سے خہر تک بیسی کے کرائے کم نہیں کرتا۔

— کوارٹروں سے مہاجوں کی بے دخلی کو نہیں روکتا۔

— مجھر نہیں مارتی دغیرہ دغیرہ اور

— دغیرہ دغیرہ پر دھیان نہیں دیتا۔

برت یہ ہے کہ ہمارے رہنماء کے سب بندیا دی جمہوریت، اسلامی سوشلزم اور جمہوریت کی قوتوںی باتیں کرتے ہیں

شکرہ میں

ابراہیم میس نبر

۸۵

لیکن نیچے جڑ کی طرف کوئی نہیں دیکھتا
جو جس میں جوں ہوتی ہے

حیرت ہے کہ ہماری محنتیں جوئیں مارنے کو ابھی تک تفہیم اوقات کا دل چسب ذریعہ (good part good) میں ہیں حالانکہ اس وقت ملک کو جو دل کی شدید ضرورت ہے ان کی افزائش تسلی ضروری ہے اور پھر انہیں حکام کے بالوں میں جو بننا دلت کی ایک بہت بڑی خدمت ہے۔

اد جوئیں بھی ایسی "ڈرینڈ" ہوں کہ جہاں عوام نے کوئی شکایت کی، حکام اسے سینیں "جوں" ضرورت لے اور سن کر فوراً حکام کے کان پر رینگنے لگے تا کہ حکام عوام کی شکایت کو لیکہ کان سے زارا سکیں۔

اس کے بعد چہر دیکھتے ہاں کہ جوں ہی جوں حکام کے کان پر رینگتے گی حکام فنا فٹ عوام کی شکایت اور تکالیف دو دکرنے میں مصروف ہو جائیں گے۔

اسی لیے دعا مانگنے کر

"رباً — جوں نوں جیون دے۔"

صدۃ پھر ساری اس بات کی پتھر کی لکیر سمجھیے کہ

"جوں" نہیں تو پھر سب کچھ جوں کا قلن "رہے گا۔" (انتساب از "نیکی کرت قافیہ جا")



صاحب ذوق اور معیاری افراد کی پسند

لسا چا بلینڈ چلتے
لسا اسپیشل چاے
اور نئی لاسا سوپر بلینڈ چاۓ

و ہر جگہ دستیاب ہے

رابراہمیم

پتھ کی بات

دنیا کا کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس کا کوئی پتہ نہ ہو بشرطیکہ وہ لاپتہ نہ ہو) یہ ممکن ہے کہ بہت سے انسانوں کے دفتر کا کوئی پتہ نہ ہو، ”تارکا پتہ“ کوئی نہ ہو مگر ان کے لئے گھر کا پتہ حرفہ ہوتا ہے۔ مثلاً خاص دشتر کرامی

یہ چھپی چینگی کا لونی میں زیجہ کی قبر کے روپ بردا کالے خان ہوشی کی بجل میں کاٹی جھگی کے میاں چنزوں کو مل کر میاں سخنوں کو پرسد۔

خیر یہ تو خاص حال سب اور پر اتنا پتہ ہے۔ مگر ماڈلن اور مختصر پتہ یوں بھی ہو سکتا ہے۔
۳۲۰۔ فراڈ آپاڈ۔ کراچی۔

پتہ لہا ہو یا مختصر ہر انسان کا کم از کم گھر کا پتہ ضرور ہوتا ہے۔ اگر کسی بقسم انسان کا کوئی گھر نہ ہو تب بھی وہ معرفت کی منزلتیں طے کر کے اپنا کوئی نہ کوئی پتہ ضرور مقرر کر لتا ہے۔ یعنی انشا راللہ خال معرفت ما شاد اللہ خال مالک سیحان اللہ بحیل احسانی اللہ بعذ عرفان اللہ آباد۔

الحمد لله — کہ اس دنیا میں کوئی انسان یہ پتہ نہیں۔ اگر بالغرض ایسا کوئی انسان ہے جو تو ہمیں اس کا پتہ نہیں۔ کیا پتہ سچ پچ کوئی انسان ایسا بھی ہو جس کا کوئی پتہ ہی نہیں ہو۔ لیکن اتنے بہت سے انسانوں کی دنیا میں لیے لاپتہ انسان کا پتہ چلاتا بہت مشکل ہے۔

بہر حال چیز کی بات تو یہ ہے کہ کوئی انسان بغیر اتنا یترب کے اس دنیا میں زندہ تورہ سکتا ہے لیکن افسانوں سے مل جن کر نہیں رہ سکتا۔

یہ ممکن ہے کہ کسی انسان کا سدا ایک پرستہ ہو، اور ہم کسی شخص کو اس کے پتے پر خط لکھیں تو کون ہیں ڈکر کے "انہاں میں کچھ پتہ بھی ہے کہ اس کا پتہ بدل گیا ہے۔"

چنانچہ اس کے بعد پتہ لگا ناپردا تا ہے کہ اس شخص کا نیا پتہ کیا ہے؟

بسی لوگ جن کا کوئی بہت نہیں جتنا دہ کسی پتے مالے شخص کی منت کرتے ہیں
بایوجی — اگر میں امی می خیال آپ کے پتے پر ملکوں والوں تو کوئی حرج تو نہیں ”
وہ آدمی اگر خوش اخلاق ہے تو کہہ دے گا کہ والوں کوئی حرج نہیں، لیکن اگر دہ آدمی بد اخلاق اور حیرچڑھے مزاج کا ہو تو اسے
ٹانٹ دے گا جولا۔

ٹا میرے پتے سے فتح کو کچھی تیراخط ملے

پھولی بستیوں میں کسی شخص کا پتہ لگانا بہت آسان ہوتا ہے۔ لیکن بڑے شہروں میں کسی کا پتہ — پتہ موجود ہونے کے
کے باوجود — دھونڈنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اے دل سین اف آپ کو بعد ازاں کوئی نہ کوئی شخص ضرور ایسا ملکراتا ہے جو
بیوپھی چلتا ہے۔

بایوجی — دنایہ تو بسنا کہ سردار محمود کھو کر کہاں رہتے ہیں۔ ان کا پتہ یہ ہے :
یہ کہہ کر وہ ایک چھپی آپ کی طرف بڑھا دیتا ہے۔ آپ چھپی پڑھتے ہیں۔
”مودہ چیز سے پالاں، چوک بی ماراں
مکان نمبر ۸۴۰۔“

آپ کہتے ہیں

”ابے یہ سامنے ہی آتھے۔“

تو دو شخص چراں ہو کر کہتا ہے

دبا میریا — کب سے کھو کر صاحب کے لیے شوکریں کھاتا چھر رہا ہوں۔

یہ بھی عام مشاہدہ ہے کہ کسی کو پتہ بتانے کے محلے میں اسکوں کے رٹکے بالعموم بڑی شرارتیں کرتے ہیں۔ حال ہی
میں اسی ہی ایک دل چھپ شزادت ہیں یہ معلوم ہوئی ہے کہ
ایک صاحب اپنے گھر کے برآمدے میں بسج سویرے شیو بناتے بیٹھے ہوئے تھے۔ سائیکلوں پر دو رٹکے
اپنے پاس پہنچے اور پوچھا۔

”قبده چودھری کلاب خال کہاں رہتے ہیں۔؟“

شیو بتانے والے مرد مشریف نے یوچھا

”انہوں نے کیا پتہ بتایا ہے؟“

”رٹکے پہنچے تو سائیکل پر سوار ہو گئے پھر لویل۔“

”پتہ تو یہ بتایا تھا کہ جس گھر کے برآمدے میں کوئی شخص بیٹھا شیو بناتا ہو تو، عین اس کے گھر کے سامنے۔
یہ کہہ کر وہ سائیکل پسیکھا جاوے جا۔

اسی طرح شریر رٹکے مسجد کا پتہ پوچھنے والوں کو میونسلیٹی کے بیت الخلا پہنچا آتے ہیں یا وادیت کا ماستہ
پوچھنے والوں کو حوالات کی سیر کراتے ہیں۔

بعض پے بعض مشہور مقامات سے نجی ہوتے ہیں۔ خلاً گرایی کی پی ای سی ایچ سوسائٹی میں کئی مکان ڈھونڈھ صنا ہو تو سوسائٹی والالیوں پستہ دے گا۔

"آپ ۳۶ نمبر کی بس میں بیٹھ کر آ جائیے جہاں کندھ کڑ آواز لگائے "چیل دالی کوٹھی"

تو آپ چیل کی طرح تیرتی سمجھیت کر بس سے اتر پڑتے۔ آگے چند قدم پڑھیں گے تو آپ کو قصائی کی ایک فرمان نظر آئے گی جو "کوئے داد قصائی" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے ساتھ دالی گلی سے مر جائیے تو آپ کو ایک چاند پر طوطا نباہدا نظر آئے گا۔ آپ اس چاند میں سیدھے نہ لکھ آئیے بلکہ دستک دیجئے درمیں ہمارا کتا آپ کو کاٹ کھائے گا"

چیل دالی کوٹھی، کوئے داد قصائی اور طوطا مارک کوٹھی اور کتے والا الک۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بڑے شہروں میں گھردار کے پتے قسم "طوطا مینا" کی طرح طویل اور دلچسپ ہوتے ہیں۔

مگر سب سے زیادہ دلچسپ پتہ حال ہی میں کرایی کے ایک نوجوان نے اس طرح بتایا ہے کہ اس سے نہ صرف اس کے گھر کا پتہ معلوم ہوتا ہے بلکہ شہر کی بلدیہ کی غفلت کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔

یہ پتہ آج کل کراچی شہر میں بہت مشہور ہے۔ سنا ہے کہ کسی زندہ دل نوجوان نے اپنے دوست کو اپنے گھر کا یوں بتایا، "قبرستان کے پاس پہنچ کر تم پہلی گلی میں داخل ہونا جیسے ہی گلی میں داخل ہو گئے تمہارے ارد گرد مکھیاں بھینچنا شروع کر دیں گی اور مجھ نہیں کہنا شروع کر دیں گے۔ مگر کھرانا نہیں۔ یہ صحیح ہے کی پہلی فٹ نیاں ہیں۔ اس کے بعد تمہیں ایک سرکل ملے گی جو آج کل ندی ہے۔ اسے جو کر کے ایک کوڑے کے ڈھیر پر پہنچ جانا اگر کوڑے کا ڈھیر نظر نہ تھے تو ندی سے سانس لینا تو اس کوڑے کے ڈھیر کی بدبو تہاری تاک سے تکڑے تی بس اس بدبو کے پچھے چلے آؤ تو ایک جگہ بارش کے گندے یا نی سے گھر ہوئے ایک جنیزے میں تھیں ایک ایسا مکان نظر آئے گا جہاں کا پوریشن کی موڑ میکھ دصلی کرنے کھڑی ہے۔ اس دہی میرا غلط خانہ ہے۔

امتاز ہزاں نگار میخ انہم کے

مضامین کا مجموعہ

درودہ

یقہ:

چھ روپے

بعد ڈست کر کے ملتا

بڑ سطھ: "شگفتہ"

واہ واہ - کیا میال کیا بیوی

• ابراہیم جلیس

یہ ہمارے لئے کافی عالم رہا ہے کہ جب کوئی لڑکا بی۔ لے پاس کر لے ہے تو اس کی ماں اس کے لیے بھی ڈھونڈنے نکل کوٹھی ہوتی ہے۔

چنان چہ جب میں نے اسے پاس کیا تو ہماری والدہ بھی ہمارے لیے ایک چاند سی دلہن اور اپنے لیے بہشتی حور کی ہو بہو
بہو ڈھونڈنے میں مصروف ہو گئیں لیکن ہم بڑے سختے میں گرفتار تھے کہ تیا ہم شادی کیں یا نہ کریں۔

اس نہیں کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے گھر کے دو فون طرف والے گھر دل میں دو بڑے سشالی شادی شدہ جوڑے رہا کرتے تھے۔

ہمارے دلیں پڑوس میں جو میاں بیجی رہتے تھے ان میں بیوی کی حالت بڑی قابلِ رحم تھی۔ میاں بڑا ظالم مرد تھا۔ شاید یہ کوئی رات ایسی ہوتی جس رات وہ اپنی بیوی کو مار کر اس کا جھکس دن کا لاتا ہو۔

اور باعث پڑوس میں جو میاں بیوی رہتے تھے، ان میں خوبصورت کی حالت نہایت عبرتیک تھی۔ بیوی بڑی قد آمد، بخاری بھر کم صحت تھی اور میاں پستہ تھا، نہایت د بلا پلا متعجنو۔ شاید یہ کوئی رات ایسی ہوتی جس رات اس کی نفل المیری اپنے سکینی خوبصورت کو مار کر اس کا جھکس دن کا لاتی ہو۔

ان دو فون پڑوسی جوڑوں کی مادر دھاڑ سے بھر دیں زندگیوں کو دیکھ کر ہمیں شادی کے نام ہی سے ہول آنے لگا تھا۔ ہم اکثر یہ سوچا کرتے کہ:-

"ذیے جنی مے بنا بیتے سے ہم صرف
لمنڈھے می اسے ٹہہ کا بھلے۔"

بیس اے سوی سوی جاہیے تھا جو
”نہ خود کشمی تھے اور نہ ہم تھے“

اور ہمارے دوستوں کا خیال تھا کہ ہم ساری زندگی گنوار سے ہی رہ جائیں گے۔ لیکن کہ اذل سے اب تک دنیا میں کوئی حوت ایسی نہیں آئی جو مرد سے بٹنے سے بچ کر ہو یا مرد کو سچ پچ سٹنے یا پتے کے خیال سے باز رہی ہو۔

اپنی دنوں ہم نے تھوس کیا کہ ہمارے رشتہ داروں میں ایک خوب صورت اصریخ سیرت لڑکی ہم میں کچھ دل چیزیں لینے لگی ہے معتبر ذراائع سے جب ہم پتہ چلا کہ وہ لڑکی ہم سے شادی خانہ آبادی پر بھی آمادہ ہے تو ایک دن موقع پاک تہبا فی میں ہم نے اس دو شیزوں سے بوجھیا۔

”اگر شاہی کے بعد ہم کبھی کبھا راپ کو پڑھ لیا کریں تو آپ ہم سے لفڑت وہیں کرنے لگیں گی۔؟“
بادی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس دو شیزہ نے اینی جوتی اتار کر بارے حاملے کی اور کہا۔

"یہ مجھے میری جوئی میسر، شادی کے بعد کا انتظار کیوں کیجئے۔ مجھے ابھی سے پہلا شروع کر دیجئے۔"

یہ حواب سُن کر تکمیل میٹا افسوس ہوا۔ کیونکہ ہمیں ایسی بیوی قطعاً نہیں چاہیے تھی جو ہم سے پشاور کے۔ یہ ہم نے اس لذتی کو اپنے دل سے اسی طرح نکال دیا جس طرح روڈسیوں نے نیکتا خود شجاعت کو راتوں رات روشنی کی وزارت عظیمی سے نکال دیا تھا۔

بیہر کچھ دن گزرے ہمارے پرنس کی ایک اور لڑکی ہم میں دل جسپی لینے لگی۔ وہ لڑکی بڑی لمبی سڑتائی ہاتھ بیاں کی تری مخصوص طاقت اور ہاتھ پخت "واقع ہوئی تھی۔ لکن وہ ہم میں دل جسپی لینے لگی تھی۔ سیلے ایک دن یہت ڈرتے ڈرتے ہم نے اس سے فوجھا۔؟" "کیا آپ بھرم سے شادی کرنائیں گے؟"

"جب ایک نہ ایک دن شادی کرنی ہے تو چلے، آپ بھی سے کروں گی:

اس بے تکلف دو شرہ سے ہم نے جس معموا دوسرے اسحال لو جھا۔

۱۰ اگر شادی کے بعد ہم کبھی کبھار آپ کو بیٹھ کیا کریں تو آپ ہم سے نفرت تو خیس کریں گی ؟
اس دو مشیر ہ نے تاک بھروس حیر محاکر کہا۔

”داه۔۔۔ آپ مجھے کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ کوئی فدا مجھے چھو کر تو دیکھ لے یا۔۔۔

یہ جواب سن کر سہمیک دم نروس سے ہو گئے اور پوکھلا کرنو چا۔

۹ مونگر یا آپ ہیں پھیٹا کریں گی۔

دو شیرخانے خوب سے کہا۔

"ہاں اگلے پنے کبھی دراہی بھی بدتمیری کی تو بھر"

مکجھت نے شادی کا بھی انتظار نہ کیا اور ساری میلیٹھیں اسیے زندگی کا ممکنہ رویداد کیا کہ شادی کا خیال تو فوراً ہی دل سے تکل

لی۔ ہس نکے کی وجہ سے تین دن تک بیج ہم گھنڈ گھنڈ بھر لکھانے سے رہے۔

اس کے بعد جسی ہماری والدہ اسارے رشتہ دار اور اسارے دوست بھاتے رہے کہ:-

یہ پیشے پیشے کی شرائط چھوڑو، دنیا میں کوئی ایسے میاں بیوی نہیں ہیں جو ایک دوسرے سے پتتے یا ایک دوسرے کو پتتے نہ ہوں۔"

لیکن ہم نہ مانے۔ آخر دنیا کے تین سال حصے تین اسپ انسانوں میں یقیناً ایسے میاں بیوی عزیز ہوں گے جن میں کبھی رہائی نہ ہوئی ہو۔

اتفاق سے انہی دنوں ہیں ایک ہواں جہاں کسپنی میں ایسی فوکری ہی کہ ہمیں سوائے برا عالم آسٹریلیا کے چار دن براعظوں، ایشا، یورپ، افریقہ، امریکہ کے ملک اور شہر شہر کی سیر یافت کرنی پڑی۔

ہم نے اس زرین موقع سے فائدہ اٹھا لیے میاں بیوی کی تلاش بھی شروع کر دی جن میں ان کی شادی کے بعد سے کبھی کوئی جھگڑا نہ ہوا ہو۔

ڈھونڈنے سے خالی جاتا ہے تو ایسے مثاں میاں بیوی کیا حقیقت رکھتے ہیں۔

چنانچہ بدل میں بھپے شہر میں ڈھنڈو رہا۔ مصدقہ ہیں ایسے مثاں میاں بیوی کا پتہ چلا تو اپنے ہی دلن پاکستان میں۔

ہمین معبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ بیخاپ کے گھاؤں ڈونگہ بونگہ میں مسکی چودھری اشہد تھے اور سماں مانی فتاں عرف بجھے نامہ ایسے میاں بیوی ہیں جن کی شادی کو ساٹھ برس گزد چکے ہیں لیکن کا دل اور نحلے کا ہر شخص کو وہ ہے کہ دنوں میں ایک دن اور ایک دن بھی کبھی ذرا سا جھکڑا یا جلو پڑا۔ پڑا غتک تھیں ہوئی۔

یہ خبر سنکریٹی خوشی ہوتی اور ہم یہ راز معلوم کرنے کے لیے فوراً ڈونگہ بونگہ چودھری اشہد تھے کھری سینج۔ چودھری اشہد تھے کے رہنکوں نے ہماری بھرپوری اور ہم نے چودھری اشہد تھے اور بے بے فاطمہ سے بار کی باری پوچھا اور کہنی بار پوچھا کہ "آپ دنوں میں پچھلے ساٹھ برس میں ایک بار بھی جھکڑا نہ ہوا۔ آخر اس کا راز کیا ہے۔

ہمارے اس سال کا بار بار پوچھنے پر دنوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ ہمیں ان کی کامیاب ازدواجی زندگی کا راز معلوم ہو گیا۔

اور وہ راز یہ تھا کہ

میاں اور بیوی دنوں بہرے تھے۔ (انتخاب از کتاب "نیکی کر تعلیم جا") ۵۵

وی پی ارسال کرنے کی صورت میں پرہ کا زائد خرچ خریداروں کو بردازنا پڑیا گا

ابراهیم جلیس

بچہ سائی

حزب اختلاف : ان افراد کا مجموعہ جو حکومتِ وقت کے ہر کام کو قتوش کی نظر سے دیکھے

ایک میان بیوی اپنی ایک بادہ سالہ بیوی اور دس سالہ بیوی کو ذہنی مریض سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک دن وہ اپنے دلفون بجوان کو مدد بیکل چیک کے لئے ملک کے اپشنڈٹ سائیکل کا ٹرست یعنی باہر نفایات کو بتایا۔

ڈاکٹر صاحب یہ لڑکی جس چیز پر بھی نظر رکھتی ہے۔ بڑی کڑی نظر رکھتی ہے۔ بڑی نظر بھی۔ ایسی کڑی نظر کہ ایک دن میری بیگم نے بچھلی مار کیتھی سے ایک بڑی عمدہ بچھلی خریدی ہر جذبہ کہ بچھلی دلے نے اس کے دام بہت مہنگے بتائے تھے۔ بیگم نے دام ادا کر کے بچھلی دال سے سہا کر یہ بچھلی اٹھا کر باسکٹ میں ڈال دو۔ مگر ہم نے بڑی حیرت سے دیکھا کہ جد فٹ لمبا اور چار فٹ ترکھنگا بچھلی دالا اس سخن تی بچھلی کو نہیں اٹھا سکا!

وہیں قریب ہی قیامت کی نظر تاثر نے دال بچھلی دالے کی چہار دیدہ دال دہ بڑھی پھیرن بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ فردًا تارہ گئی کہ کہ نہیں سی بچھلی اس ہے کئے مسئلہ سے بھلاکیوں نہیں اٹھ رہیا ہے۔ اس نے ہماری بیٹھی سے کہا۔

بیٹھی — تو دو بچھلی کی قیمت پر سے اپنی کڑی نظر ٹالے تاکہ بھر دیٹا بچھلی کی قیمت سیکھ سکی۔

ہماری بیٹھی نے بچھلی کی قیمت پر سے اپنی کڑی نظر اٹھا کر ٹھٹے غصہ سے پھیرن پر اپنی کڑی نظر ڈالی تو اصر محیر منہ بیٹھی سے دو نہیں منیں بچھلی اٹھا کر بیگم کی ٹوکری میں ڈال دی۔

ڈاکٹر صاحب —! یہ تو تمہی بہلی شکایت۔ اب دوسرا شکایت یہ ہے کہ اس روکی سے جو بات بھی کہو وہ ایک کان سے سنا کر

عصرے کا ان سے اڑا کر تھا ہے۔ حیرت کا اور آخری شکایت یہ ہے کہ جب یہ کسی بات پر اڑ جاتا ہے تو ایک دو دفعہ نہیں بلکہ ۴۲۲ دفعہ بھی مہنڈ۔ سچھاڑا تب بھی اپنی صند پر اڑا کر رہتا ہے۔

*

روگی کا کس ڈاکٹر کو بتانے کے بعد بابیت نے روٹ کے کے بارے میں بتایا۔

اس صاجزادے کی تو کچھ پرچھئے ہی نہیں، جس چیز کو دیکھا ہے بڑی تشویش کی نظر سے دیکھا ہے جس دلخواہ کے باہم میں پرچھو تو بڑی تشویش کا انہاد کرتا ہے۔

مہر فضیلت ڈاکٹر عقول شدہ فیں وصول کرنے کے بعد والدین سے یہیں مخاطب ہوا، اور اس کا پہلا جملہ بھی وہی تھا جو ہر ڈاکٹر کا تکمیل کلام ہوتا ہے۔ یعنی

”غمبرتے کی کوئی بات نہیں، بھی بھی بالکل نارمل ہے اور بچہ بھی ذہنی طور پر بالکل صحت مند ہے بلکہ ان دونوں کی جن شکایت سے آپ دونوں کو فکایت ہے وہی شکایت اس بھی اہد پچھے کے نہایت شامد اور مستقبل کی ضا اعتماد ہے۔“
ماں باپ پر بڑے حیران ہوئے کہ یہ شکایت محلہ ان بچوں کے شاندار مستقبل کی فناخت کیسے ہو سکتی ہیں؟ مگر ڈاکٹر نے تنفس سے انہیں سمجھانا فردا کر دیا۔

آپ کے ہزار جزا دی میں ساری خصوصیات انتظامیہ کی ہیں یعنی ملک دشمنوں سے لیکر چیزیں کی مہنگی قیمتیں تک کڑی نظر رکھنا کسی شکایت کو ایک کان سے سُن کر دوسرے کان سے اڑا دینا بخوبی پڑا اجا ہا جسے بنہ بانہ ہندی رائج سہی بھی کہا جاتا ہے دفیرہ دفیرہ۔
اب بھا صاحبزادہ — یہ بھی خیر ہے کہ لذہنی مریض نہیں ہے بلکہ اسی کا ذہن تو قابلِ رشک حد تک صحت مند ہے
غمبرہ صاحبزادہ ہر چیز کو تشویش کی نظر سے دیکھتا ہے اور ہر دلخواہ پر ہر بڑی تشویش کا انہاد کرتا ہے تو اس کے باہم میں یہ پیشیں گئی ہے کہ وہ بڑا ہو کر ہمارے ملک کی حزب اختلاف یا اپوزیشن کا بہت بڑا میثود بنے گا۔

باپ یہاں سرکاری حکومت خدا جو نہیں اس نے یہ سننا تو مارے دھشت دھشت اس نے گھبرا کر پوچھا۔

کیا کہا ڈاکٹر — میرا لا کا بڑا ہو کر حزب اختلاف کا لیدر بنے گا؟

مالک نے سر پیٹ کر باعثے ہائے شردہ کر دیا۔

ہائے ہم لٹھ گئے۔ ہم تباہ ہو گئے۔ روٹ کا حزب اختلاف کا لیدر بنے گا۔

باپ نے اپنے آپ کو قدمے سنبھال کر پوچھا۔

ڈاکٹر — کیا آپ جانتے ہیں — کہ حزب اختلاف کے کیا معنی ہوتے ہیں؟

ڈاکٹر نے جواب دیا۔

”ہماسے ملک میں میڈیسین کی تعلیم چونکہ لئے سے زیاد تر انگریزی میں ہوتی ہے اس لئے میری اور دو پچھو نزدیکیہ اجھی نہیں ہے۔ ویسے بھی اور دل میر کا ذائقہ نہیں بلکہ مادر کی ذائقہ ہے اس لئے اور دلناک کے معنی مفہوم کے لئے مجھے اُس دلناک دیکھنی پڑتی ہیں اور ایک اُردہ لفظ میں یہی نے حزب اختلاف کے معنی پوں دیکھے تھے۔“

حزب اختلاف = ان افراد کا مجموعہ جو حکومت وقت کے ہر کام کو تشویش کی نظر سے رکھتے، حکومت کے ہر انتلام پر گہری تشویش کا اظہار کرے۔ امتحان کر پاس کرے۔ قراردادیں زیادہ پاس کرے۔ اپنے نام یعنی حزب اختلاف کی لائج رکھتے ہوئے اپنے ہم خیال آپس کے افراد اور جماعتوں میں بھی اختلاف کو ہر قرار سکھے۔ (دفعہ ۱۳۳) بالکل نہ توڑے البتہ اسٹریٹ لیپ اور شرپیٹ سکھا یاں زیادہ توڑے۔ پرسیں کافنس میں جلسہ عام کی طاولت کرے۔ دعیہ دغیرہ۔

لغات کی اس تعریف کی وجہ سے یہ لہذا اگر اس صحیحی کی غیری میں ہر چیز کو تشویش کی نظر سے دیکھا ہے اور حکومت کے ہر اقدام پر گہری تشویش کا اظہار کرتا ہے تو یہ اپنے اس سے بُرا حزب اختلاف کا رہنا اور کون ہو گا۔ ہنلا آپ والدین کو میرا یہ مشورہ ہے کہ آپ اسنجھے کو "تشویش" کا نعروں سے نہ دیکھیں دیکھا آپ کو دیکھا نہیں دیتا کہ آپ ملازم سرکار ہیں۔

ڈاکٹر توہیہ مشورہ دے کر چلتا ہوا مگر سرکاری طازم باپ اور ماں نے سینہ کوبی سخیر درعا کر دی۔

ہائے ہائے ہمارا پُدا نا قاعدہ ہی اٹھ گیا۔ پُدا نے قادری کے پچے تو بڑے ہو کر آپ کھلاتے تھے۔ والدین کو کھلاتے تھے یہ بچہ بُرا ہو گا تو میری نوکری کو کھا جائے گا اور پھر جیں کی ہوا گھائے گا، اور ہمیں کو فت کھلاتے گا۔ ماں باپ کی اس گریہ وزاری کو نجی نے حب روایت ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اشاریا مگر بچے نے لپٹے والدین کی اس آہ و بکا کو پہلے تو بڑی تشویش کی نظر سے دیکھا اور ان کے بارے میں اپنی بہن سے گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے آسے مشورہ دیا کہ:-

"باجی — اتھی اور ابو پہ کڑی نظر رکھو وہ کہیں دہ دونوں فرط غم میں اپنے آپ کو کچھ کر دیجیں، مگر بایگی نے بھی یہ مشورہ ایک کان سے سُنا اور دوسرے کان سے اٹھا دیا۔

۸۵
("دوشیزہ" پاکستان سے)

مشہور مزارع نگار بھارت کے پند کھنڈ

کے مزاحیہ مفاسد

تیرنگم کش
کیا نام نہ ہو گا

قیمت مجلد ہر لے روپے ۸ قیمت مجلد ۸ روپے

توسط "شگوفہ"

تکریب اپنے

بنامِ مجتبیٰ حسین

مالک ام : نبی دہلی

کے لیے ہم سے بُجا ہو گئے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ جلد ہی ہندوستان آنے کے انتقال کی خرچی تھی۔ پرسوں کسی نے بتایا کہ مر جنم آپ کے مبنی پر ہے۔ اپنی بے خبری پر بہت ندامت ہوئی۔ مجھے آپ کے اسی المعنی اور ناقابل تلقین مقصان پر بہت بہر دیا ہے۔ جانی کا بیشتر کے لیے مجھنا ہو جانا جیں المنک ساختہ ہے اُنہیں اس کا کچھ ادا لے گر سکتا ہوں کیونکہ خود زخم خود رہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور خانہ العسکر کے دوسرا فزاد کو صبر جیل عطا زرمائے۔ آمین

مُزینی ! چند دن ہوئے پاکستان میں ابراہیم علیس کے انتقال کی خرچی تھی۔ پرسوں کسی نے بتایا کہ مر جنم آپ کے مبنی پر ہے۔ اپنی بے خبری پر بہت ندامت ہوئی۔ مجھے آپ کے اسی المعنی اور ناقابل تلقین مقصان پر بہت بہر دیا ہے۔ جانی کا بیشتر کے لیے مجھنا ہو جانا جیں المنک ساختہ ہے اُنہیں اس کا کچھ ادا لے گر سکتا ہوں کیونکہ خود زخم خود رہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور خانہ العسکر کے دوسرا فزاد کو صبر جیل عطا زرمائے۔ آمین

سابق ذری مژاں پڑھت

جناب محمد علی حکومت کرنا بخوبی

مُزینی بیتچنی ! کل کے اجات سیدت میں ابوالیم بیلس کے انتقال کی خرچہ کیبے حد صدر پر ہوئی اور میں اپنے فرم کی شد کو بیان کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ ہم سب ان کی ادبی صلاحیتوں پر کافر نہیں ہوں۔ وہ اٹھا پائی کے ادیب اور طنز نگار تھے ان کے انتقال سے اور دلائی عظیم ہستی سے خودم ہو گئی۔

آن کے خلوص اور آن کی خوشی مذاق سخفیت کے سمجھ تائیں دقتیں تھیں مجھے بھیشہ = احساں ہوتا تھا کہ بعض حالات نے ہمیں آنی سمجھدا کر دیا تھا اگرستم ظریفی دیکھو کے اب دھیشہ بھیشہ

مدد شعبہ اور در
ڈاکٹر گوبی پست دنارنگ جامعہ ملیہ اسلامیہ
آپ کے برادر نرگس کے انتقال کا معلوم ہو کر رنج ہوا خدا
انھیں اپنے ترب کلمتوں سے لذاتے اور تمام راجحین کو صبر
کی توفیق دے کر موت برحق ہے اور کلام خانہ ندرس کا یہ اُنی تازہ
ہے۔ یکس زیادہ دکھ بے وقت موت کا ہوتا ہے اور اسی ہوت
کا جو بڑے کار آسکے دلے امکانات کو فرم کر دے۔ مر جنم یک
بلند پائی اور ایک منفرد مزار نگار اور ممتاز صفائی تھے۔ بڑے
جانی کی شفقت اور بہت کی سخن رکھتی ہے اور سکھنست یہ مردازہ

باقیتہ عہدی - بحثی

برادر عزیز،

بچپنے وہ تین دن سے سوچا ہوا ہوا کہ تمہیں خدا نکھوں گھر کی لکھوں
پر سے دیسنے والوں میں صرف ثال نہیں ہونا چاہتا بلکہ آپ کے
بھائی کی ہوت جن حالات میں ہوئی ہے کہ کافی ضر ہے کہ باقاعدہ
انتحاج کیا جائے مگر کیسے؟

مجھے یاد آتا ہے کہ تقریباً ۲۰ سال پہلے میں نے "بھر جو بھرنا"
پر صحتی اور جو ربانہ پیدہ جنمیں نے یادب میں جب ان پر اختیار
کی تو اس کے جواب میں آپ کے بھائی نے ایک معذن نکھا تھا "سر جع
ڈربتا ہے" وہ درستاک مخزن مجھے یاد ہے۔ ہر حال مجھے ان ۷

روپر تازہ دو ملک ایک کہانی" بھی پسند ہے۔

اتاسب لکھنے کے بعد دبی ہسپر کی ہدایت کر سکتا ہوں میرا
دل پر سہ قبول کیجئے۔ دیکھنے الفاظ لکھنے پر تعصیت ہو گئے میں پھر مجھے
گذاشتی ہے کہ آپ میرے بذہات کو تابل قبول سمجھیں گے۔

اعجاز صدیقی

مدیر شاعر۔ بحثی

غزالیہ مجتبی مُسین

آپ کے برادر عزیز اور اولاد کے مشہد اور بھائی ابراهیم
جلیس کا مرگ ناگہاں پر کن الفاظ میں اپنے رنج دافوس
کھانہ رکوں؟ آپ پرادر براہم مگر صاحب پر جو گزری ہے
وہ میری چشم قصور سے دد نہیں۔ اثرِ حرم کو اپنا جوارِ حیث
میں جلد سے اور آپ سب کو صبر جیں عطا فرمائے۔
ابراهیم جلیس کا شرب روزگار کی خدمت ہو گئے۔
یہ کیون وہ امر ہیں۔

پندستان میں بھی آپ کی ہوت کا ابردست روٹی ہوا ہے۔

بند ہبادے تو کیا گزردہ ہے۔ اس کا مجھ کو اندازہ ہے۔ مجھے اپنے دکھ
میں برابر کا شریک کجھے۔

جیسا رانی با تو۔ حیدر آباد

مجتبی صاحب:

آج اخبار میں ایک ایسی ناقابل برداشت بزرگی جسے
ماننے کو دل نہجا ہا۔

ایک بھائی کے رشتے سے یعنی آپ کا غم ہم سے زیادہ
ہو گا لیکن ابراہیم جلیس کے انہوں جانے کا دکھ ہم سب کا مشترکہ
دکھ ہے۔

وہ میرے ان پستیدہ اذپہن میں سے تھے جنہوں نے
ہمیں سکھایا کہ محری الفاظ طنز کے کڑے دنگ میں ڈب کر کبھی
جادو گزی کر سکتے ہیں۔

ابراهیم جلیس کو پاکستان والے اپنا کہنے لگتے لیکن جب
کبھی ہم اپنے اذپہن پر ناز کرنے بھیتھے تو ہماری زبان پر سب
سے پہلے ابراہیم جلیس کا نام آتا تھا۔

میری سمجھو میں نہیں آتا آپ کو تسلی کے لیے کیا نکھوں!
خدا آپ کو اس غم کے سینے کی طاقت دے۔ انہوں نے ایسی وقت
جان دی جب حالات کے بخوبی میں بھنسے وہ اپنے اورش کے لیے
جد رہنہ کر رہے تھے اور آخر احمدیں ہوت تبل کرنا پڑی۔ سیکھ
انہوں نے شکست نہیں ملنی۔ ابراہیم جلیس کی شخصیت کا یہ کہت
غیظ پہلو ہے!

ڈاکٹر انور محمدیم۔ حیدر آباد

ڈیر مجتبی

جلیس آپ کے عزیز تھے

اور چارے بھی۔ یہ دکھ بدار بھی ہے۔

ابراهیم جلیس بھر

گز کا ہوتا تھا ادب میں پاکستان کا جہا ہون تو دیوبھی نہیں
وہ جسم نے فتنے خود سے بُلڈی تھا اور جس سے لی کر ہزاروں باتیں
کرنے تھیں۔

خواجہ عبد الغفور (بہبی)

عزیزی مل

آف سیاست کا صدر ذمہ بر کا شامہ طلا وہ خبر نہایت
بما فرمسی کے سے تو فی کراں ایم جلیس انتقال کر گئے انداد اب
کو جہاں پہنچنے کوئے طوں میں مستھنے سادھے شاک ہے یہ میں ایک
بڑا نبڑت ساغر ہے۔ جیدہ آباد کی گنجائی نامہ سہیوں میں
سے ان کا بھی گذرا باہت افسوس کا حادثہ ہے۔ ہارے سے یہ
یک شخصہ مدد ہے اور یہ اپنے کے ساتھ راہ کے شریک نہ
ہیں۔ خدا آپ کو صبر جیل عطا زمانے اور مردم کو عزیزی رحمت۔

سلیمان خٹلیب - سعید بھر

بیان سے بہبی

ابراهیم جلیس کا پانک مرست سے بگرگز شہزادوں میں
ڈوب گیا۔ یعنی ان بزرگوں میں چہرے ملتے رہے۔ اسفا اس
کرتے ہے۔ قلائد زندگی میں رہات کو اچھی کے بند ہونے کی
حکایت پڑھی تھی۔ ابراهیم جلیس "بگرگز" کلب سے پیاراں تھی تھے
اسکا مرست میرے یہے ایک حادثہ ہے اور انداد ادب کے
ایک ناقابل تھانی نعمان۔

جلیس نے انداد ادب کو کیا نہیں دیا۔

ایک تازہ نستم

ستگفتہ انداز

ذوبہ نو اسلوب مل میں اتر جانے والا بانجھن
اُسریں ہر زندگی کا ایک نیا کتب کرول دیا۔ اپنے دن کا نام

جب سے = اذوٹھک بھر ملی ہے، آپ کو نہ کھنے کی
فلک میں ہوں۔ میکن جدت ہی نہیں ہو جی تھی۔ آپ کو سر درج تکہ
دی جاتے۔ جملہ کی مرست اور جو تھا ایسے جملہ کا جس کا سینکڑا
صافت دہا ہے دلے ہوں، جس کا تحریری دوسرے کے دلوں میں
زنگا کا لولہ پسیدا کریں۔ آپ کے سے صد مل غیظم ہے۔ بس الغ
تطفیل کا آپ کی محبت اور صبر ہے۔

بھر کے ہوئے گید کہ سے اُن کی حالت کا بھر بھی نہیں
ستھی کا درغایا پھنسد ہو دن پچھلے ان کا ایک تحریر کہیں پڑھنے
کو چاہتی ہیں۔

میں تو اُن کے بین سے بھجوانے کے بعد بھی اسی بھی نہیں
لکھاں دیکھا کا حس بھی بھی نہیں ہوا۔

ایسے ہی سافروں سے آنہ اپنا ہوت کر واکر کرتا ہے۔

اخستر حسن (جید آباد)

بھر بھنی :

ابراهیم جلیس کا پورسہ کس کو دیں۔ تپڑے جمالتے
تو پھرے بھاگی رہا در عزیزی!

کٹھا جلوی اور کس تھد اپانک جلیس ہے سے بھڑگے۔ دُو یہ دن پہلے
تو اُن کا نام بدبار اخبار میں پڑھا تھا۔ اور آفاقی دیکھ کر ان کا ایک
بہت پُرگاہ خطہ ۹۳۴ کا لکھا ہوا، پُرانے خطوط میں سے نکلا تھا تو
اسے پڑھ کر بہت کامبھلی بسری پاپندا دا آگئی تھیں اور اس رات
دریکھ اُن کا ذکر ہوتا رہا تھا اور بلاست سے میں نے کہا تھا کہ اب
کراچی ہارہے ہیں تو جلیس سے بھی ملائمات پڑگا۔ پہلی دفعہ کئی
سال پیشتر نیو یار آئے تھے تو بُرے پیارا اور اصرار سے ہاکتا

یدش کی۔ اور ہم جلیس کے دہ بدنیعیب الی چلن ہیں۔ جس کا آخری درت کا حوصلہ اور حادثت دے اور مردم کو کوئی حکومتوں مطابق (آسمیں)

دیوار کر سکے نہ کر سکتے ہے۔

جس کو معرفت اپنے کر کی کی سکتا ہے۔

مرفے ہم دعا سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ آج کا بارگاہ بندہ داڑھ جسہ کو دعا سے محفوظ رکھیں۔

خدا پسند ایکان کو صبر جیسی عطا رہا۔

گرچھن چندل (دہلی)

پیارے مجتبی

آپ کے برادر محترم ابراہیم جلیس صاحب کی زفات کے مدیر جانکاہ کا انبارات کے ذریعہ علم ہوا۔ ولی رنجی ہوا۔

اربی دنیا کے ایک ملیٹم فن کار اور اپنے شفیق بھائی کی ہمراہ سے آپ کا دربار انعقاد ہوا ہے جو ناقابلِ کافی ہے۔

خدا مر جنم کو جنت الفردوس میں عبک دے۔ اور پسندان کو صبر کی توفیق عطا کرے۔ آئین

تم اب رنس مر جنم کے لئے درست بدھا ہی رکھئے۔

کل نفسیِ ذاتیہ ہلکتے۔

ماش شم صدقی (لکھنؤ)

مجتبی صاحب

آپ کو ایک خط اکتوبر میں لکھا تھا اور میں آپ کے جواب کا انتظار ہی کر رہی تھی۔ قوی آواز میں آپ کے بھائی صاحب کے انتقال کی خبر پڑی۔ یقیناً بہت بڑا ستم ہے میری بھو میں ہیں اور ہم اسے کوئی الفاظ میں اپنے نام کا اعلان کروں۔ میں پورا طرح اس کو میں شرکیت ہوں۔ یہ سوچ کر اور زیادہ افسوس ہے کہ مر نہ ہے قبل آپ اپنیں ہیکو بھی نہ سکے۔

حلاقت ہیں تقدم عدم پراساس دلائے ہیں کہ دنیا میں

تفہی تنویر (السندھ)

دو بخت پہنچے لیسرا افتر سے علاقات ہوئی تھی۔ اُنکے پس شیاست آئی ہے جس سے حکوم بروک ابراہیم جلیس کا انتقال ہو گیا۔ بے حد کہ ہوا۔ تمہیں حکوم ہے کہ مجھے، رسہ دین نہیں آتا۔ اپنے دکھ کا انہصار کرنے والے میں نہ ہوں۔ اُن کا روت اور اُب کا ایک ناقابلِ کافی انعقاد ہے۔

بلراج پوری — جمود (متاز صحافی)

قرمِ مجتبی صاحب

میں بھی آپ سے ملا ہوں اور نجیس صاحب سے مگر بھائی کے کاڑہ شمارہ ہیں ابراہیم جلیس کا واد میں آپ کا صحن پڑھ کر دو فوٹ شخصیتیں اجنبی نہیں لگ رہیں۔ جب آن کے مردے کی خبر پڑھی تو بیسوں روز سرہ کی بہروں سے مخفف نہ گلی تھی۔ آج جب احساس ہوا کہ ابراہیم جلیس شخص ایک ادیب نہ تھا، اُن بھی تھا، اُبھالہ اور بیٹا بھی تو سیری اپنی بہت سی دلختی ہر کوئی رگن کر دیکھ اجنبی نہیں۔

میں یہ دعوئے تو ہمیں کرتا کہ مجھے بھی آپ کی طرح صدمہ ہو لے مگر صدمہ کا اتنا بوجھ مزدروں سی کی کہ اسے ہمکاری کے لیے آپ کو یہ خط لکھنے کلبے اختیار جدت کے۔ جوت کہہ ایسا ہونے کا ان جانلی پیز ہیں۔ پھر روز کلکاڈ کوئی جانا پہنچانا شنسیں کا کلکاڈ ہوتا ہے۔ اسی سوچ سے مافوس سا ہوں۔ پھر ایک ان جانے والیں کی دوست پر یہ ایک سرگزین جملک رہے ہیں؟

شاید صرف اوت پر ہیں۔ بیانک تاگ نہیں ہے آپ نہ اور

ایک عوامی وقت رہا کہ تھا، چیزے اور جس کے خاتمہ ان ۱۹۷۵ء کے ہیں۔ کہندہ کہ جنگ میں بھارت پر بمباری ہونا پڑا۔ تقریب کے شریعہ میں ہی مذکور ہے ذکر جیسا کہ جان پہچان شکھیں نظر ہیں آئیں۔ تقریب عادی رکنا دشوار ہو گیا۔ اُن حالاتِ دائمیت کو یاد کر کے جن میں بھارت ہوئی تھیں، میں پہنچ پڑا اور بینز تقریب کئے وہ اپس آگئا۔ مخفیوں کے ساتھِ جہالتِ دائمیم ہوا۔ مگر بخوبی تقریب کی میرے اسرد مہسب کو کوئی جوست یہ بچا سیں تقریبیں ذکر نہ سکتیں۔ کئی رسول لی کوششوں کے بعد ہم بندوں کی سرکار کو، مذکورے میں کا میا بہار گئے تھے کہ اُس حادثے سے پارکے ہوئے لوگ وہ اپس آسکیں۔ چنانچہ ۰۰ ہزار لیے لوگ وہ اپس آئے اور اس وہار کا جنگ میں انہوں نے ملک سے اپنا دنیاواری کا عملی ثبوت دیا۔

میرے اب بھی چند عزیز ترین «وست اُس» پڑا ہیں۔ ایک بیوی کی طرف وہی دیے اپنے بیٹے، جو کینٹھے برطانیہ پا ریکر فریڈنک میں بھے بندوں کی باشندوں کے ہائے میں اپناتے ہیں۔ اُپکت اُس کے بندوں کی اپنی آمد بھی جوڑوں کے ساتھ اپنی ایجادت کا صدر بنا شے رکھ سکیو۔

اس کا یہ مطلب یا مقصود ہرگز بیان نہ ہوا ہیجے کہ ان کی اپنی دلیل اُپکت سے دنیاواری کمزور کی جائے۔ مگر اُپکت کی دلیل بھی ہے جو دنیا اُپکت کی طرف کی جیادہ نہیں بننے ہائے۔ اس ملک میں درسی امریکہ، عرب ہائک اور پچھلے بھلدویں کے ملکیت سے الگ رہے ہیں۔ کیا وہ ہے کہ اُپکت کا ذریعہ منہ کو کم فی الہیم بکا جائے؟ ہم اب تک پاکت کا نظر، اور پاکت کا نکت کے ذریعے بھوپالیں پائے ہیں۔

فلکی صحافت میں ایک حسین اضافہ

فلکی صورت
(انگلین و قوتو افسٹری)

میراثی
غوث احمد فیض

پت: گرین پلیس، حیات نگر، حیدر آباد

ایک عوامی وقت رہا تھا، چیزے اور جس کے خاتمہ ان ۱۹۷۵ء کے ہیں۔ کہندہ اس نتیجت کی جائے بسنا اور فہاری پہنچ کے یہ چند مذکور ہے۔ بکھر نامت اور فرشتے کے -

جزوانیہ کے نقشہ پر یہی نیز دنک اور ملکوں کی جیرتی کھڑے ہے، اور یہ روحش تماشہ کی بن کر آنسو پہنچ کے خداوند کو بھی غمیں کر سکتے۔ بکھر بھی بھیں۔ ۹۔

یہی پارے غصہ اور زندہ سے اپنا آوازِ حسین کے آپار

بیٹھنے والے دکن کے حق میں جذبات اور بندہ ترکنا چاہتا ہوں جیہے حسین کو ختم کرنے کی سیاسی بات فہیم کرتا۔ مگر اُن دکن کو کیوں

بچوں، یا جانے، جوہرا اپنا خون تھے، ہمارے گوشت پوشت کا صدر

تھے؟ سٹایلہ وہ رقت آئے جب اُپکت کی بندوں کی

کے بیویں کیلئے وہی دیے اپنے بیٹے، جو کینٹھے برطانیہ پا ریکر فری

ڈنک میں بھے بندوں کی باشندوں کے ہائے میں اپناتے ہیں۔ اُپکت اُس کے بندوں کی اپنی آمد بھی جوڑوں کے ساتھ اپنی ایجادت

بکا جائے؟ ہم اب تک پاکت کا نظر، اور پاکت کا نکت کے

ذریعے بھوپالیں پائے ہیں۔

یہ اس فصل کا سیکھ پڑھے۔ مگر میری دلچسپی میں اسی ذریعے

بھلوے سے زیادہ ہے۔ میرے دل کے پچھے بھلوسٹ میں مگر پچھے

حصیں بھی، دل بھوپالے، دل بھر بھی آتھے۔ بکھر جسٹے پہنچے

کہا تو ہے۔ اپنے دل کے کچھ سرحدیں گذان میں ایک ہی ڈنک جس کیلئے میں جوڑھتا۔ بلکہ میں بیٹھنے جہاں یا اصرحتا۔ دہان میرا

تہذیب و کامرانی کا مرکز

گذشتہ برسوں کے دوران میں اس ریاست کو تین رفواری کے ساتھ صنعتیات کے لئے جو پُرہ زور مہم چلائی گئی ہے اس کے نتیجے میں بندھایا چل کے بخوبی میں دفعہ آذھرا پر دیش ترقی رکارانی کا مرکز بن گیا ہے۔ ریاستی صدھ مہام حیدر آباد میں اور اس کے اطراف و اکناف میں مرکزی شعبہ کے تحت بہت سے بُجھ و قار صنعتی اداروں کے قیام کے باعث ہندوستان کے صنعتی نقشے میں اس ریاست کی معنادافروں اہمیت میں مزید اضافہ ہوا ہے۔

لپنے ااض پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ ۱۹۵۶ء میں ہمارے یہاں صرف ۲۵ بڑی اور اصطھنیں تھیں جن میں صدر صنعتی کی کل مقدار ۲۴۳ کریڈ روپے تھی۔ اب صنعتی یونیٹوں کی تعداد ۱۵۰ ہو گئی ہے اور ان میں صدر صنعتی سرماں کی مقدار ۶۴۰ کریڈ روپے تک پہنچ گئی ہے۔ چھوٹی صنعتیوں کے شبے میں ہمارا ترقی ہو گئی ہے۔

صحیح کی کہ ذریں سے روشن سر زمین دکن میں واقع ریاست آذھرا پر دیش یہی صنعت کا مرکز کو جو یہاں کے پہاڑیں اور قبائلی خالقوں میں نہیں نہیں صنعتیں قائم کرنا پاہئے ہیں وسیع اقسام کی ترقیات ہا پیش کر قریب ہے۔ سال ۱۹۷۸ء کے سال میں صنعتیوں کے لئے ۲۰۵ کروڑ روپیوں کی تباہ کرنے کی تحریک فراہم کی گئی ہے۔

ناظم محکم اطلاعات و تعلقات عامہ
آذھرا پر دیش، حیدر آباد

No. 2/78-۷۹

پھر خوب

ہیں رسمی سے جھوٹا دیکھ کر حاضرین نے تائیوں سے چست سر پر اٹھا۔ لیکن قبل اس کے کدار باب فدق کے اس ساتھی اندھوڑیں ہیں جو بھر کر فخری ہوتے طوطا پری دلت پکھتا تاہماں ان اپنے سر پر اٹھا کر شنکنے کے خطرناک ارادے سے ہماری طرف پکا۔ ہم تب تک میز دلیل شیش پر پھر ٹکا چکے تھے لیکن کوسا ابھی تک ہاں سے نا تمدن ہیں تھی۔ وہ جیسے ہی تبلی کے زندگی پہنچا ہم نے رستی کی روئے لیک اور اٹھانی بھری اندھ طوطا پری کے سر پر سے ہوتے ہر نے دھری طرف نسلی گئے۔ ہماری اس جست "زور جہالت" ہر دو نے طوطا پری کو یقیناً لمحاتی تاک پہنچایا تھا۔ اس کی اسی کیفیت سے فائدہ اٹھا کر ہم نے بدستور ہم سے جھوٹتہ ہوتے مکالمہ باندھ کے ایک اور راستہ کا آغاز کیا۔ لذت کام درہن پیشوے پوچھو، لذت نام وہیم بخی سے وہیر لذت شدید بن ہاشم سے پوچھو، لذت دار و رسن بوجوچنا، ہو خادم سے پوچھو۔ ॥ اعرافِ لمحاتی تاک کا خرچیہ ہی نہ ایسی دلیل ہے، طوطا پری کا دوبارہ تluار سوت کر ہماری طرف لیکا۔ اور اس بار اس قدر پھر قدر کھانی قلام نے کہ یوں لگا جیسے آنکھوں کے آگے کوئی سا پک گی ہو۔ اس پک جھپک میں انعام سے رستی نے مرکزی کدار ادا کر کے ہمیں ادا کار کی حیثیت سے ہی سہی ملکوز نہ سلامت رہنے دیا۔

ہیوں کو حسب سابق طوطا پری اپنے ہی بھر بک میں رسمی سے کھلاں طرح الجھوگیا کیا اس کا تluار طالا ہاتھ بدل لے کے رسمی صندب میں بھیں گی۔ ہمارا عال اس ثوابتے کی طرح تھا جو صرف شنکنے کے سوارے کامستی ہوتی ہے اب جب کہ تھکے کے کام کو تسلی مکا سہا مامل گیا تو سمجھئے از مریز زندگی مل گئی۔ رسمی کے شنکنے پا ہی کرفت مصبر طکرته ہوتے طوطا پری تلبے بیس ہاتھ میں تھی ہوئی لا حمار تluار سے یوں اپنی تluار لڑانے لگ گئے دکن کی خواتیں ڈھونک کے گیت میں گذگد بندھی لکھ دیں سے کوئی "کھلیتی" نہیں۔ یہ گویا ہمارے فن کا کمال تھا۔ تluار بازہ کا کام تکس تھا۔ حاضرین کے بے قابو قیمتیہ احمد تالیں اسی بات کا کھلا بثوت تھیں۔ چنانچہ ہم نے کام تکس کے تابوت میں آخری کیل شنونکنے کی غرض سے اپنی تluار کی دوک طوطا پری کے اپنے تھہرے پیٹ پر گاؤ دی۔ تluار کی قوک کا اس کے جسم سے لگنا تھا کہ وہ کھلی کی طرح تڑپ کر اچھل پڑا۔ تب اچاک کی یاد آیا کہ گلگمراں، طوف اپنی کی بے بڑی کمزوری ہیں۔ ہم نے چھلا کر سوچا کامش تملٹے کی ابتداء میں اس کی یہ

کمزوری یاد آجائی پھر تو ہمیں کرب کی اتنی منازل سے نہ گزرننا پڑتا۔

بہر حال اتنی دیر تک زندگی ادھر ہوت سے آنکو مجھ کی کھینچنے کے بذاب بے خوف و خطر ہو کر گئی گئی کردے یعنی کا وقت ایسا سپری سوچ چلا ما تھا سے جانے رہتے ہم ادھر تواری کی زک طوطا پری کے جسم کو تھوڑی ادھر ہیں اجھل پڑا جسے ان کے پردوں میں اسپر تگ لٹھے ہوئے ہوں۔ اس تماشے نے حاضرین کو اس مقام پر پہنچا دیا کہ ان میں ہنسنے کا بھروسہ نہ رہ۔ غالباً تماش پینک کی اس بے بسی کو دیکھ کر ہی اس تماشے کے اختتام کا اعلان کر دیا گی۔ ساتھ ہی اگلے اندھا حسروں تماشہ کے تعلق سے کوئی اعلان فرمائے ہے پہلے حاضرین کو کچھ دیر تو قصہ فرمانے کے لیے کہا گیا۔ طوفاں پرداہم پتھر کو دنظر ڈالا ہوا اسی جانب والے راستے سے کیٹھ کے پتھر چلا گیا اور ہم نے تواریخی کرسی کی مجاہد کی طرف دین رشد سے قدم پڑھائے جیسے جس نماز ک اندام حسیدہ کے لیے ہم نے یہ جان لیتا ڈیں۔ رضاخواہ ہمارے راستے پھر وہ کاموں میں صلیبی کے مچان ہی پرتوکھڑی ہے۔ جس وقت ہم پہلی پرستی شش روکیلا ہی پڑا ان کی سپیدیاں شاید اگلے تماشے میں حصہ لینے کے چاہی عجیں پیسوں ہیں دیکھ کر بجا ہے اس کے کردار خوش ہوئیں مباہک باد کے پھل بر سائیں الٹا ہماری آہٹے سے چونک پڑیں جسے پھاری آمد سے ان کے انہاں میں اچاہک خل پڑا ہو۔ یہی بڑا تعجب ہوا۔ لیکن جب ان کے نزدیک پہنچے تو شجو کے انہاں کا دل کھل گیا۔ شجو کے اس انہاں کی وجہ تھی اور اذمیں جو مچان کی پسل طرف سے اُر بی تھیں اُر چکر یہ اذمیں ایک دم بند اور حاضر ہنہیں قیس نما ہم اتنی مبہم بھی نہیں تھیں کہ بات سمجھ میں نہ آتی۔ اور یہ تو کافی اندھا جسی دلوقت سے بتا سکتا تھا کہ یہ آذمیں قبلہ چھ خوب اور سزیچ خوب کی تھیں بب دلیجہ کی سمعی اور گرم گفتاری بتاتی تھی کہ ان کے ماہیں اس وقت اس امر پر ہرگز بحث نہیں ہو رہی ہے کہ کھل پنج میں مرغ مسلم ہونا چاہیے یا دتبہ مسلم۔ وہاں تو دو طاویں "میں مرغی مرد اور قسم کی تفعیل گفتگو ہو جی ہی عجی بیشتر کے اضطراب اور بے جہی کو حکوم کرتے ہوئے ہم نے پیارا اور اپنا بیت سے الی کے شانے تھی تھا کہ اور شجو کو ساتھ میں ہوئے مچان کے اسی سرے کی جانب قدم پڑھائے جو صرے آوازیں اُر بی تھیں۔ مچان خاصی طویل دعویٰ تھی خاص طور پر اس کی لمبائی۔ مچان کا پچھلا سرا اسی صحیح اور حاضرین کے ناویہ نظر سے باہر رکھا۔ اس سرے کے اختتام پر جو ہی سلیمانی میں کل پنج سے بنی ہلوا کا سلسہ تھا جسے یہودی جانب سے پہلوں سے ڈھانک دیا گیا تھا۔ ہم نے موزوں جگہ کا انتخاب کر کے اندھ سے تبدیریک ہند پر نے والی آؤاندوں کے نہانے سے خود کو اچھی طرح پیدا کی اور ٹھیک کر کے پہلو کو دو دلار کا یا چالا انداز سے درست نکلا جس جگہ سے ہم نے پر دہ بسر کا یاد تھا۔ اس جگہ کا پنج ٹوٹا ہوا تھا خاصہ بیڑا شکاف تھا۔ یہی دلیل تھی جو آذمیں اس قدر صفا سانی دے رہی تھیں وہ کاچن کا چکٹھا خاصہ سا اندھ پر وف قسم کا تھا۔ سب سے پہلے وہم نے کالج کے اس پاٹا لے کرے کا جائزہ لیا۔ کمرے کا مختصر فرنچ اور دیواریں پر جگہ جگہ نصب آئئے بتاتے تھے کہن میک اپ روم ہے۔ اس وقت میک اپ روم میں سڑاکیڈ سڑاچہ خوب کے علاوہ کسی تیرے مستقیس کا عدد دو تک پتہ نہیں تھا۔ دو ٹوٹی کی تفعیل کیا اور پھر ہوا آذمیں نہست دبرخاست اس بات پر دلالت کرتا تھا کی الحال وہ دونوں دو منہج سرڈیں نہیں ہیں۔ پر دہ بسر کا ہی سب سے پہلا پتھر جو ہمارے کافول سے نکایا وہ قبیلہ چھ خوب کی زیارتی پوٹگ کا نتیجہ تھا۔

"وَتَمَّ اَيْنِي بِرَحْبَ سے باز نہیں آؤگی۔"

پر صوف کا آذمیں خاص دلیرانہ تھا۔ لگتا تھا جسیسے تمام ترجمت یک جا کر کے جیدا کیا گیا ہے۔ میک سزیچ خوب نے

نے جانا جس پے اتنا فی کام مٹا پڑے گیا اسی سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ موہو قبده بچ غب کی اس دلیراد دھمکی کو گیدھ بھپکی سے نیا۔
تیر کیتیں۔ صرصی ہوتے ہی تھے نئے لبجھیں مو صرف کر سمجھے نے ہی کوششیں کی۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا یہو ہیرے و قادر کا تیر
اتا کہ کہتے ہو جب تک ہماری طرف تجھے کے حوف پر بیٹھی تھیں، اٹھ کر کہ اس طرح کھڑی ہو گیتھ کہ لکھ جیسے سوتھ "ہم سے فر
سایہ زدہ ہئے ہو۔" سوتھے پر نیک شعبدہ جلالہ جلد اتنی قشن مسلم سہرہی تھیں۔ قالہ عالم طوبیۃ کے دوپھی
ایک ایک اپنے تکوپڑہ دکھانی دے رہی تھیں بلکہ اصلی تدوبلو، "بھی اگر پہنچے اس تازہ اڈیش کو دیکھ لے تو خود بھی یہی بارچکا اگر
بچے جائے۔" تجویز کا آخری ایم تکوپڑہ کی سادی تھا۔ قبده پر خوب نالیا تکوپڑہ کے اس تازہ اڈیش
کی ایسی پر جانے سے بُوک رہے تھے۔ اور یہ مسئلہ دوں ہی کے بے وقار کا مسئلہ بنا ہوا تھا۔ دورے ہی پر تاسہ دیکھو کر ہیں
روزہ گر بھی خیال آرہا تھا کہ اس بعد پیس میں گھر سرے پر غب ایسی بچھوپو جو ہو گر جوئیں تو بہت نہیں کھتوں کے دقار کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔
بکر دعہ کیوں جائیں سب سے پہلے تو فودہ میں اپنا لکار خطرے میں نظر آیا۔ باوجود اس کے کیا کیا عدد حسین پیکھ پہلے ہی سے ہملے
یہ ہو جیں موجود تھا میکن "کلوپڑہ" بہر عالی تکوپڑہ تھے کہ جس نے "تھہر صر" کے سارے "مردانے" کا ایاں خراب کر دیا تھا۔ کہ ہر صر
کی کثیر مردانہ و پادی اور کلد حسرے تھیں فیکر پر تقصیر مصری خان۔ ادھر پورے شیرینی تکہ چہ خوب کی گردبار مگر کسی آدم
کا پتی آؤں آواز پھر گئی۔ اپنی اس چہ خوب کا نتیجہ جاتا تھا ہر۔؟

موصوف کے اس جیلخ پر مو صوف کسی زخمی ناگزی کی طرح پیش اور خاباً مو صوف کی اٹھوں میں اٹھیں چکا رہ کر چکار
پئے ہیجے میں دھیں۔ یعنی اس ادھر حسب مادت ایک بڑیا فی قبده عینہ کرنے کے بعد بات کو آگئے ڈھایا
۔ نوب معاجب قبلہ نتھے بلکہ پہنچنے سے پہلے ذرا ابھی تجویزی تک نہیں اور دیکھنا کہ آپ فی الحال تیجہ کی قیمت ادا کرنے کے
کے لوقت میں ہی بھی نہیں۔ مو صوف نے غالباً قبلہ چہ خوب کی دیکھنے کے لیے تھی، مو صوف ماہی پے اُپ بلکہ
جنت کے اعتبار سے ملے تھے اُب کی طرح اپنی جگہ کھا کر نئے مو صوف نے اس بار تاہین صبر و تاکید ضبط۔ ترس کسی بھی
میں مو صوف کا مشتمل دیا۔ جائیے نوب صاحب، نواد نجواہ اپنا بلڈ پر شیر مت ڈھایے۔ گھر مالا کر آرام کیجئے اس پر طنز مشو کرے
بعد محترمہ ایک پر فہرست ملکت کے ساتھ۔ باہر نکل گئیں اور قبلہ چہ خوب ایک جائے ہوئے جوہری کی طرح نہ صالی ہو کر جو
یہی دو حصہ ہو گئے جو دوں اپنے اپنے اس بچھا اور چکا ہو۔ اپنے فالد بزرگوار کی اس ناکفیت پر حالت کو دیکھ کر شبیو بجلارک سکتی
ہیں، بھی اپنی دوکنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ خدا اس ادھری سی تھے کہ میں ادھر جاؤں یا ادھر جاؤں۔ اس ادھر میں
کے دو مالی اچانک ایک جانی پچھا فی نسوانی آواز ہاوسے کاں کے پر دوں کوادھر گز کر ساخت سے ہمراهی۔ ہم نے پلٹ کر دیکھا
قبلہ چہ خوب کے قریب پھولی امام اپنی تمام تر تھامت و تھامت کے ساتھ کھڑی تھڑائی۔ اسی چڑا فرڈ کو ڈھیل
دینے کا نیجہ اخڑی اگتی تاخانمان کی حدت خاک میں ملانے۔ میں اب بھی کہتا ہوں کاٹ کے چینک دو اس سرٹے ہوئے نامو
کر۔ اس پر نما پھٹے کو۔ "پھولی امال کے س جلاں بعد اور خطرناک مشورے پر میں ان کا اونہ خطرناک اقدام ادا کیا۔ کس سفاکی نے انہیں
نے اپنی چیتی بی کو خود اپنے ہاتھوں سے ختم کیا تھا، مھعن آغا جرم کی پا جا شیں میں کہ پڑوں کے کسی بٹے سے اس کا آنکھ مٹکا ہو گیا تھا۔
چہ حشرات الارض کے سلسلے میں مو صوفہ صرف ایسی سزا جو یہ کر سکتی ہیں بلکہ بنسن نفس نفس پہنچے سے یہ فردار کو پہنچا
سکتی ہیں اور پر اشرف المخلوقات کے قتل سے جو کچھ نہ کریں تھوڑا ہی ہرگا۔!

کے صرف مزاجیہ مضامین اور کالمون کا انتخاب شریک کیا گیا ہے
البتہ ان کی شخصیت دفعہ پر مضامین ہر حیثیت سے مخلص ہے۔
جذب عابد ملی خان صاحب مدیر سیاست اور
جناب محبوب حسین جگر صاحب شریک مدیر سیاست کی
وہ نہائی کے نتیجہ میں ابراہیم جلیس نمبر کی سورہت الگی حکم
ہر سکی جس کے لئے ہم ان محترم شخصیتوں کے ممنون ہیں۔

پھر ملیں کے اگر حد الایا

— (اداریہ)

زندہ دلان جیدہ آباد کی سالانہ تعاونیب کے پھر ایک پاہ
التواء کی وجہ سے مسی کے ہمینے میں سودنیر کی بجائے "ابراہیم جلیس"
شائع کیا جا رہا ہے۔ یوں عجی "ابراہیم جلیس نمبر" ابتدائی فیصلہ کے
مطابق میں ۸۱۹ ہی میں شائع ہونا تھا۔ لیکن سالانہ تعاونیب
کی وجہ سے یہیں چون تہک کے لئے اس کی اشاعت ملتوی کرنی پڑی
تمی — جلیس نمبر کے ساتھ ہی "ڈرامہ نمبر" کی تیاریوں
کا کام سرعت سے چل رہا ہے۔ ڈرامہ نمبر کی تابیغ کا بھی آئینہ
مہینہ اعلان کر دیا جائے گا۔ زندہ دلان جیدہ آباد کی سالانہ تعاونیب
اب رہات کے پر نومبر ۸ء میں منعقد ہوں گیں۔

ہمیں فخر ہے کہ ہندو پاک کے غیر دینیک
سمانی، نامور انسان نویس، ہالٹ، مزان ٹھکار ابراہیم جلیس
کو خارج عقیدت پیش کرنے کے لئے یہ خصوصی نمبر شائع کرنے
کا ہیں موقع طلب ہے۔ پاکستان میں ابراہیم جلیس کے انتقال پر
روزناموں، سہنہ دار و ماہناموں کے خصوصی نمبر نکلے اور مسلسل
ان پر مضامین شائع ہوتے رہے ہیں، ہندوستان میں بہت
کم مضامین چھپے ہیں۔ جبکہ ابراہیم جلیس نے سابق جیدہ آباد
کے باخول یہیں پر دریش پائی، شہرت کی ابتدائی سڑھیاں یہیں
ٹھیک ہیں۔ جیدہ آباد کی حیثیت سے سارے ملک میں بھیجا نے جاتے
تھے اور ان کے قریبی عزیز و رشتہ دار عثمان آباد، گلبرگہ و
جیدہ آباد ہی میں رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان پر ہندوستان
اور فاصل طرد پر جیدہ آباد کا حق زیادہ ہے۔ زیرِ نظر خصوصی اشتہ
سے یہ حق ادا تو ہیں ہوتا یہکن کسی قدر اس تکایت کا ازالہ ضرور
ہو سکتا ہے کہ ہم ابراہیم جلیس کو بھوئے ہیں ہیں۔ اس
شارہ میں "شگفتہ" کے مزاج کو محو ذر کھوئے ہوئے ابراہیم جلیس

ماہنامہ
شکوفہ کی ایک خصوصی اشتہ

ڈرامہ نمبر

(بہت جلد شائع ہو گا)

♦ اُردو ڈراموں کا جائزہ ہو اُردو کے مزاجیہ ڈرامے
(اٹھاب)

* مختلف زبانوں کے شاہکار
مزاجیہ ڈراموں کے تاجم

اور

کئی دسری دیپچیلیں

ڈرامہ نمبر کے مہمان مدیر:-

— اگر سرحدی شہر و ڈرندہ ٹھکار

نلم اسکرین پلے رائٹ ارڈر مکالمہ نویس

ڈرامہ نمبر کے مضامین رووانہ کرنے کا پستہ:-

سماگر سرحدی ۳۰/۱۵۶۳ سرداز بگر

و سان۔ بیسی۔ ۴۰۰۰۲۲

al. 11 Copy 5

SHUGOOFA
31, Bachelor Quarters, M. J. Market, Hyderabad-1

Postal Regd. No.

IBRAHIM JALEES

May 1978

Photo

RAO'S TUTORIALS

(BANK STREET. Phone 51577)

(The Leading Institution in Tutorial Education)

STARTS

ST. THERESA

NURSERY & PRIMARY SCHOOL

(FOR GIRLS & BOYS)

at 3-6-106/4 SHAHID YAR JUNG LANE, HIMAYATNAGAR
HYDERABAD-500 029.

By adding new classes every year

ST. THERESA

will be a high school in next few years.

Pupils admitted now can complete the school in St. THERESA itself.

RAO'S TUTORIAL branch

at the same address

For Girls before noon

— For Employees in the evening